دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۹۲ ماہ محرم الحرام ۱۴۳۵ھ مطابق ماہ نومبر ۲۰۱۳ء عدد ۵

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات

علامہ شبلی جنوری ۱۸۸۳ میں علی گڑھ پہنچے۔ وہاں ان کے قیام کے ابتدائی دنوں کا مطالعہ کیا جائے اور اس دوران ان کی سرگرمیوں کا تجزیہ کیا جائے تو صاف محسوس ہوگا کہ انہوں نے وہاں اپنے قیام کی ابتدا ہی سے ایک متعین مقصد کے تحت اور منصوبہ کے مطابق کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ جب ان کو سرسید کے بیش بہا کتب خانے سے استفادہ کا موقع ملا اور وہاں ان کو تاریخ اسلام کی ان نادر کتابوں تک رسائی حاصل ہوئی جو یوروپ میں چھپ رہی تھیں اور جن کی خود ان کے اپنے الفاظ میں مصر والوں تک کو خبر نہیں تھی، تو ایک نئی دنیا ان کے سامنے جلوہ گر ہوئی۔ یہیں رومن امپائر کے عروج و زوال پر گبن کی شہرہ آفاق کتاب اور بعض دوسرے یوروپین مصنّفین کی کتابوں کے اردو ترجمے ان کی نظر سے گذرے اور ان کے وسیلہ سے ان کو یوروپین محققین کے اسلوب تحریر اور انداز تحقیق سے آگاہی ہوئی۔ یہیں پروفیسر آرنلڈ سے ان کے گہرے مراسم قائم ہوئے اور ان کے درمیان باہمی افادہ اور استفادہ کا جو سلسلہ قائم ہوا وہ دونوں کے لیے بہت مفید رہا۔ آرنلڈ نے مولانا سے عربی سیکھی اور ان کو کسی قدر فرنچ کی تعلیم دی۔ اس کے علاوہ انہوں نے مولانا کو تحقیق و تجزیہ کے جدید اصول و آداب سے روشناس کیا۔ مولانا نے ان امور پر پوری سنجیدگی اور گہرائی سے غور کیا اور ان میں سے ان چیزوں کو اخذ کیا جو عمدہ، مفید اور علم و تحقیق کی ترقی میں معاون تھیں اور جو غیر مفید تھیں انہیں نظر انداز کر دیا۔ اس غور و خوض اور ابتدائی مطالعہ کے نتیجہ میں انہوں نے اپنی مستقبل کی سرگرمیوں کے لیے ایک راہ عمل متعین کی اور وقت کے مقتضیات اور ملی ضروریات اور مصالح کے پیش نظر ایک جامع منصوبہ مرتب کیا۔ ملی ضروریات کے تناظر میں انہوں نے اپنی علمی سرگرمیوں کے لیے تاریخ اسلام کا موضوع منتخب کیا اور پھر یہی ان کا مقصد زندگی بن گیا۔ اس میدان میں اپنی غیر معمولی خدمات کی وجہ سے وہ بجا طور پر ہندوستانی مسلمانوں کے تاریخ کے معلم اول قرار پائے۔ اس وقت کے مخصوص حالات میں اس موضوع کی جو اہمیت تھی اور اس میدان میں انہوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے اور ان کے جو اثرات و نتائج مرتب ہوئے وہ محتاج بیان نہیں۔

ابتدا میں علامہ شبلی نے اسلام کی ایک جامع تاریخ لکھنے کا پروگرام بنایا تھا۔ لیکن یہ موضوع بہت وسیع تھا اس لیے اسے تاریخ بنی عباس تک محدود کر دیا۔ اس منصوبہ پر انہوں نے علی گڑھ پہنچنے کے کچھ دنوں بعد ۱۸۸۳ ہی میں کام شروع کر دیا تھا اور اپریل ۱۸۸۴ تک اس کا ایک معتد بہ حصہ مکمل ہو چکا تھا۔ لیکن وہ جس نوعیت اور معیار کا کام کرنا چاہتے تھے اس کے پیش نظر یہ موضوع بھی بہت وسیع تھا چنانچہ اس کو مزید محدود کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اب ہر خاندان کی سب سے اہم شخصیت کی تاریخ لکھنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ یہی سلسلہ نامور فرماں روایان اسلام کے نام سے

موسوم ہوا۔اس منصوبہ میں ایک اور اہم تبدیلی کی گئی۔اس کا ذکر تو کہیں نہیں ملتا لیکن پوری صورت حال کو سامنے رکھا جائے تو بآسانی اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا علامہ شبلی نے علی گڑھ پہنچنے کے بعد ہی 'تاریخ بنی عباس' پر کام شروع کردیا تھا لیکن ان کی پہلی تحقیقی کاوش ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' اس کے کئی سال بعد ۱۸۸۷ میں سامنے آئی۔اس سے یہ نتیجہ نکالنا شاید بیجا نہ ہو کہ مطالعہ اور تحقیق کے دوران شاید ایک ایسا مرحلہ آیا جہاں انہوں نے محسوس کیا کہ اس نوعیت اور اہمیت کے علمی منصوبہ کا واقعی حق ادا کرنے کے لیے مزید تیاری، مطالعہ اور تحقیق و تجزیہ کی ضرورت ہے۔مبدأ فیض کی طرف سے ان کو دل و دماغ کی جو غیر معمولی صلاحیت ودیعت کی گئی تھی وہ کسی ایسے کام پر مطمئن نہیں ہوسکتی تھی جو اعلیٰ ترین معیار پر پورا نہ اترتا ہو۔کالج میں ورود کے بعد اگلے چند برسوں تک بظاہر ان کی شناخت ایک اچھے شاعر کی رہی۔اس دوران انہوں نے فارسی میں کئی اعلیٰ درجہ کے قصائد لکھے جو کالج میں آنے والے ممتاز مہمانوں کی خدمت میں پیش کیے گئے۔یہ کالج کی خدمت کا ایک طریقہ تھا۔ان کی شاہکار 'مثنوی صبح امید' بھی اسی دور کی یادگار ہے۔لیکن وہ اپنے بنیادی فریضہ سے غافل نہیں تھے، خاموشی اور پورے انہماک سے وہ اپنی آیندہ علمی اور تحقیقی سرگرمیوں کے لیے درکار ضروری ساز و سامان کی فراہمی میں مصروف رہے۔ان کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے سرسید نے ان کو اپنی لائبریری کے استعمال کی عام اجازت دے رکھی تھی۔ان کی مزید سہولت کے لیے اپنے بنگلہ کے احاطہ کے ایک گوشہ میں ان کے لیے ایک رہائش گاہ بھی فراہم کردی تھی جسے عرف عام میں شبلی کی بنگلیا کے نام سے جانا جاتا تھا۔اس پورے عرصہ میں وہ پورے انہماک سے اپنے مطالعہ اور تحقیق و تجزیہ میں مصروف رہے اور چند سال بعد جب اس کے اولین ثمرات سامنے آئے تو دنیائے علم انگشت بدنداں رہ گئی۔۱۸۸۷ میں جب انہوں نے اپنا پہلا تحقیقی مقالہ ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے لکھنؤ اجلاس میں پیش کیا تو پورے ملک میں اس کا چرچا ہوا۔مولانا سید سلیمان ندوی نے علامہ شبلی کی اس پہلی علمی کاوش کے بارے میں لکھا ہے کہ ''یہی وہ مطلع ہے جس سے علامہ شبلی کی شہرت کا آفتاب سب سے پہلی دفعہ طلوع ہوا''۔واقعہ یہ ہے کہ ۱۲۶ سال پہلے لکھا ہوا یہ مقالہ آج بھی ویسے ہی تر و تازہ ہے۔اسی سال ان کی پہلی کتاب 'المامون' اس شان سے سامنے آئی کہ تین مہینہ کے اندر اس کا پہلا ایڈیشن ختم ہوگیا۔اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۸۷ میں سرسید کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوا۔ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ کسی مصنف کی پہلی تصنیف کو ایسا قبول عام حاصل ہو۔آنے والے دنوں میں علم و تحقیق کی دنیا میں ان کو جو مقام و مرتبہ حاصل ہوا اس کے پیش نظر ان کی عظمت کی اساس کی اس خشت اول کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ہماری خوش قسمتی سے اس کتاب کا مسودہ، جو ان کی غیر معمولی علمی فتوحات کے نقطۂ آغاز کی حیثیت رکھتی ہے، دست برد زمانہ سے محفوظ رہ گیا۔یہ علامہ کی چھوٹی پوتی محترمہ مومنہ سہیل صاحبہ کے پاس محفوظ تھا جو کراچی میں رہائش پذیر ہیں۔

صدی تقریبات کی نسبت سے جب علامہ کی باقیات کی تلاش و جستجو شروع کی گئی تو اس کا پتہ چلا۔ ہم ان کے اور وہاں مقیم خانوادہ شبلی کے دوسرے ارکان کے شکر گذار ہیں کہ انہوں نے یہ گراں مایہ علمی ورثہ دارالمصنّفین کو عنایت فرمایا۔ اب یہ گراں بہا مخطوطہ دارالمصنّفین کی لائبریری میں محفوظ ہے اور مناسب دیکھ ریکھ کی وجہ سے اتنا طویل عرصہ گذر جانے کے باوجود اچھی حالت میں ہے۔ یہ مخطوطہ کتاب کے دوسرے اور زیادہ اہم حصہ پر مشتمل ہے۔ علامہ شبلی کے بارے میں یہ بات معروف ہے کہ وہ اپنی تحریر کو خوب سے خوب تر بنانے کے لیے اس میں برابر حک و اضافہ کرتے رہتے تھے۔ اس کے بھرپور شواہد اس مخطوطہ میں دستیاب ہیں۔

علامہ شبلی کی شہرۂ آفاق تصنیف 'الفاروق' ۱۸۹۹ میں منظر عام پر آئی اور اس انداز سے آئی کہ چھپنے سے پہلے ہی پورے ملک میں اس کا غلغلہ بلند ہو چکا تھا۔ یہ کتاب مطبع نامی، کانپور میں چھپی تھی۔ اس زمانہ میں مطبع نامی حسن طباعت کے لیے معروف تھا۔ غالباً اس اہتمام کی وجہ سے جو کتابوں کی اشاعت کے سلسلہ میں یہاں کیا جاتا تھا، اس مطبع میں کتابوں کے چھپنے میں بہت وقت لگ جاتا تھا۔ اس سلسلہ میں علامہ شبلی اس کے مالک سے نالاں رہتے تھے۔ اس کے باوجود اپنی کتابوں کو وہیں چھپوانا پسند کرتے تھے۔ 'الفاروق' کی طباعت کے بعد کسی وجہ سے اس کا مسودہ مصنف کے پاس واپس نہیں آسکا۔ حالانکہ ایک ایسی کتاب کا مسودہ جس کی تصنیف میں انہوں نے اتنی کوہ کنی کی تھی اور جو ان کو بہت عزیز تھی، یادگار کی حیثیت رکھتا تھا۔ اب یہ مسودہ مولانا آزاد لائبریری کے شعبہ مخطوطات کے جواہر کلکشن میں محفوظ ہے۔ ہندوستان کے پہلے وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے نام پر اٹاوہ میں ایک میوزیم قائم کیا گیا تھا۔ یہ غالباً مولوی بشیر الدین صاحب اور ان کے رفقاء کی کوششوں کا رہین منت تھا۔ اس میں خاصی تعداد میں مخطوطات اور دوسرے نوادر جمع ہو گئے تھے۔ بعد میں یہاں محفوظ مخطوطات مولانا آزاد لائبریری کے شعبہ مخطوطات میں منتقل کر دیے گئے اور وہاں جواہر کلکشن کے نام سے موجود ہیں۔ اس طرح 'الفاروق' کا مسودہ بھی مولانا آزاد لائبریری میں منتقل ہو گیا۔ یہ معلوم کرنے کا کوئی قرینہ نہیں کہ مصنف کے پاس واپس پہنچنے کے بجائے یہ مسودہ کس طرح اٹاوہ پہنچ گیا۔ اس مسودہ پر کاتب کے لیے مصنف کی ہدایات اور کاتب کے بنائے ہوئے نشانات موجود ہیں۔ صفحات بلاترتیب ہیں۔ 'المامون' کی طرح اس میں بھی مولانا کی خوب سے خوب تر کی جستجو کے شواہد بکھرے ہوئے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ آخری وقت تک حک و اضافہ کی یہ عادت زندگی بھر مولانا کے ساتھ رہی۔ اگر مولانا کے تمام دستیاب مسودوں میں ان عبارتوں کا جنہیں انہوں نے قلم زد کر دیا ہے ان تحریروں سے موازنہ کیا جائے جو ان کی جگہ لکھی گئی ہیں تو ان کے طرز تحقیق اور انداز تصنیف کے ساتھ ان کے علمی اور فکری ارتقا کا اچھا نقشہ سامنے آجائے گا۔ اس مسودہ کی ڈیجیٹل کاپی دارالمصنّفین کی لائبریری کے لیے حاصل کر لی گئی ہے۔

مقالات

غبار خاطر میں عربی اشعار۔ تصحیح و تخریج کے مسائل

ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی

(۲)

(۱۳) ص ۲۰۸:

ومما شجاني أنني كنت نائمًا   اعلّل من برد بطيب التنسّم
الى أن دعت ورقاء من غصن أيكة   تفرّد مبكاها بحسن الترنّم
فلو قبل مبكاها بكيت صبابة   بسعدى شفيت النفس قبل التندّم
ولكن بكت قبلي فهيّج لي البكا   بكاها فقلت الفضل للمتقدّم

یہ اشعار دو شاعروں کی جانب منسوب کیے جاتے ہیں: نصیب بن رباح (ف تقریباً ۱۰۸ھ) اور عدی بن الرقاع (ف تقریباً ۹۵ھ)۔ حاشیہ نگار لکھتے ہیں:

''ان میں سے تیسرا اور چوتھا شعر کامل مبرد (ص ۵۰۴) اور کتاب الحیوان (۳:۲۰۶) میں نصیب بن رباح اور الشریشی کی شرح مقامات (۱:۱۴) میں عدی بن الرقاع کی طرف منسوب ہیں۔ گمان غالب ہے کہ چاروں شعر عدی بن الرقاع کے ہیں''۔

اس حاشیے میں دو باتیں درست نہیں۔ مبرد نے کامل میں تیسرے اور چوتھے شعر کو نصیب کی جانب منسوب نہیں کیا ہے بلکہ صاف طور پر عدی بن الرقاع کے نام سے لکھا ہے۔

جہاں تک شرح مقامات کا تعلق ہے تو حریری (ف ۵۱۶ھ) نے مقامات کی تمہید میں آخری دونوں شعر شاعر کا نام لیے بغیر لکھے تھے۔ ابو العباس شریشی (ف ۶۱۹ھ) نے شرح (۱: ۳۴) میں پہلے دو شعر بھی لکھے اور چاروں اشعار کا قائل عدی بن الرقاع کو بتایا۔

ریاض۔ سعودی عرب۔

اس سے قبل مرزوقی (ف ۴۲۱) نے بھی حماسہ کی شرح (۳: ۱۲۹۰) میں ان اشعار کو عدی کی جانب منسوب کیا مگر شک کے ساتھ۔ اسی طرح صدرالدین بصری (ف ۶۵۶ھ) نے حماسہ بصریہ (۳: ۱۰۹۶) میں انہیں عدی کے نام سے درج کیا، لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ ان کی نسبت نصیب بن رباح کی جانب بھی کی جاتی ہے۔

جاحظ (ف ۲۵۵ھ) نے کتاب الحیوان میں (۳: ۲۰۶) آخری دو اشعار کو نصیب کی جانب منسوب کیا ہے جیسا کہ حاشیہ نگار نے لکھا ہے، اور یہ کتاب ان اشعار کا قدیم ترین ماخذ ہے۔ عدی کی جانب نسبت کا سب سے قدیم حوالہ مبرد (ف ۲۸۵ھ) کی الکامل (۳: ۱۰۲۹) ہے۔ ابوالحسن علی بن سلیمان الاخفش (ف ۳۱۰ھ) نے الکامل کی روایت براہ راست مصنف سے کی تھی اور اپنے نسخے پر جا بجا حواشی بھی لکھے تھے جو کتاب کے بعض قلمی نسخوں میں محفوظ ہیں۔ انہی کی بنیاد پر یہ حواشی مطبوعہ اڈیشن میں بھی داخل ہو گئے ہیں۔ عدی بن الرقاع کی جانب ان اشعار کی نسبت پر اخفش نے یہ نوٹ لکھا ہے کہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ شعر نصیب کے ہیں۔

ایک اندلسی عالم ابوالولید وقشی (ف ۴۸۹ھ) نے بھی الکامل پر حواشی لکھے تھے۔ اس مقام پر انہوں نے بھی اخفش کا یہ نوٹ نقل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو القرط علی الکامل (ص ۵۷۷) گویا ان کے نزدیک بھی یہ شعر نصیب کے ہیں۔

اخفش کی تائید میں ہمارے پاس دو اور قوی ثبوت ہیں۔ ایک یہ کہ ابوالعباس ثعلب (ف ۲۹۱ھ) نے عدی کا دیوان مرتب کیا تھا اور اس کی شرح بھی لکھی تھی۔ یہ دیوان ۱۹۸۷ء میں عراق سے شائع ہو چکا ہے اور اس میں یہ ابیات نہیں ہیں۔ مرتبین نے آخر میں مختلف کتابوں سے متفرق اشعار جمع کیے ہیں، ان میں البتہ ان اشعار کو بھی شامل کر لیا ہے۔

دوسری طرف بعض مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ نصیب کے ایک قدیم دیوان میں یہ اشعار موجود تھے۔ شریف مرتضی (ف ۴۳۶ھ) نے اپنی امالی (۱: ۳۳۰) میں چاروں اشعار کی نسبت نصیب کی جانب کی ہے۔ اس مقام پر امالی کے تین قدیم نسخوں میں جو چھٹی اور ساتویں صدی کے آغاز میں لکھے گئے ہیں ایک حاشیہ ملتا ہے جس میں ''دیوان نصیب'' کے حوالے سے ایک شعر کے متن میں فرق کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی قدیم عالم نے نصیب کا دیوان

مرتب کیا تھا۔ اور اس میں یہ اشعار شامل تھے۔ افسوس کہ اس وقت کتب خانوں میں دیوان نصیب کے کسی قلمی نسخے کا سراغ نہیں ملتا۔

اس موقع پر یہ وضاحت نامناسب نہ ہوگی کہ فواد سزکین نے تاریخ التراث العربی (۲: ۳:۱۵۶) میں فہرست ابن ندیم کے حوالے سے لکھا ہے کہ نصیب کا دیوان ۷۰ اوراق میں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ عربی میں نصیب کے نام سے دو شاعر ہیں۔ یہاں جس شاعر سے بحث ہے وہ نصیب بن رباح ہے جو متقدم ہے اور تمیز کے لیے اسے نصیب الاکبر بھی کہتے ہیں۔ یہ بنو امیہ کے عہد کا شاعر ہے۔ دوسرا نصیب الاصغر ہے جو عباسی خلیفہ مہدی کا غلام تھا اور تقریباً ۱۷۵ھ میں وفات پائی۔ ابن ندیم (یا ندیم) نے الفہرست (۱:۵۱۵) میں اسی نصیب الاصغر کے دیوان کا ذکر کیا ہے فواد سزکین نے دونوں شاعروں کو باہم گڈمڈ کر دیا ہے۔

ڈاکٹر داود سلوم نے مآخذ کی مدد سے نصیب بن رباح کے اشعار کا ایک مجموعہ ۱۹۶۷ء میں مرتب کیا تھا جو ہمارے سامنے ہے۔ یہ اشعار اس مجموعے کے ص ۱۳۰ پر مذکور ہیں اور ان کی تخریج ص ۲۰۰-۲۰۱ پر دیکھی جا سکتی ہے۔

آخر میں ایک بات اور کہ غبار خاطر میں دوسرے شعر کے مصرعہ ثانی میں ''تفرّد'' کا لفظ آیا ہے اور حاشیے میں اشعار کا جو ترجمہ مولانا آزاد (یا اجمل خان) نے لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ کاتب کی غلطی نہیں ہے۔ تعجب یہ ہے کہ ہمارے سامنے جو مآخذ ہیں ان میں کہیں یہ لفظ نظر سے نہیں گزرا، ہر جگہ ''تردّد'' کا لفظ آیا ہے۔

جہاں تک ان اشعار کے اعراب کا تعلق ہے تو مالک رام کے اڈیشن میں یہی نہیں کہ آٹھ مصرعوں میں ایک کے سوا کوئی مصرعہ مکمل طور پر درست نہیں ہے، بلکہ بعض مصرعوں کی حالت نہایت قابل رحم ہے۔ خدا جانے ان خوبصورت اشعار کی یہ درگت کس نے بنائی لیکن آخر میں ذمہ داری تو مرتب یعنی مالک رام پر ہی عائد ہوتی ہے۔

(۱۴) ص ۲۱۹، ۲۶۳:

وحبّب فانّ الحب داعية الحب وكم من بعيد الدار مستوجب القرب

یہ شعر غبار خاطر میں دوبار آیا ہے اور دونوں جگہ ''وحبّب'' لکھا ہے یعنی تحبيب سے

فعل امر کی صورت میں ۔طبع ثالث میں جس پر مالک رام کے اڈیشن کی بنیاد ہے اس میں اور حالی پبلشنگ ہاؤس کی طبع اول میں بھی اسی طرح ہے ۔شاعر کا نام بھی دونوں جگہ ان اشاعتوں میں عالیہ بنت مہدی لکھا تھا۔صحیح نام عُـلَیّه ہے چنانچہ مرتب نے متن میں نام کی تصحیح کی اور حاشیے میں اس تصحیح اور شعر کے لیے الاغانی (۱۰:۱۷۶) کا حوالہ دیا،لیکن متن کی غلطی کی جانب ان کی توجہ مبذول نہ ہوسکی۔حالانکہ اغانی میں مذکورہ صفحے پر اور اس کے آس پاس کئی بار یہ شعر آیا ہے اور ہر جگہ ''تحبَّب''، یعنی تحبُّب کا فعل امر ہے اور وہی درست ہے۔ ''حبّب'' کا یہاں موقع نہیں۔ یہ گمان کرنا بھی صحیح نہیں کہ ام کلثوم نے شاید اس طرح گایا ہو۔ام کلثوم کے زمانے میں مصر میں عربی ادب کے جو اساطین موجود تھے ان کے ہوتے ہوئے یہ غلطی ممکن نہیں تھی ،اور وہ بھی ایسے مقبول ومشہور شعر میں۔

مآخذ میں اس شعر کے بعد تین اور اشعار ملتے ہیں۔کہیں مکمل قطعہ نقل ہوا ہے،کہیں آخری دو شعر اور کہیں صرف زیر بحث پہلا شعر۔

صاحب اغانی (ف ۳۵۶ھ) نے علیہ بنت المہدی (ف ۲۱۰ھ) کے حالات میں (۱۰:۱۸۳،۱۸۵،۱۸۷) محمد بن حسن الکاتب اور محمد بن طاہر کی کتابوں سے جو روایات نقل کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر جو علیہ نے گائے تھے اسی کا نتیجۂ فکر بھی ہیں،لیکن دوسری جگہ (۲۲: ۵۰-۵۲) محمد بن الجہم البرمکی اور خلیفہ مہدی کے غلاموں کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ یہ قطعہ ابو حفص شطرنجی کا ہے،علیہ نے صرف اسے گایا تھا۔

ابوحفص کا باپ عباسی خلیفہ منصور (ف ۱۵۸ھ) کا غلام تھا۔اس کی تعلیم وتربیت خلیفہ مہدی (ف ۱۶۹ھ) کے محل میں ہوئی ۔شاعر ، ادیب اور بہترین مصاحب ہونے کے ساتھ شطرنج کھیلنے کا ایسا ماہر تھا کہ نسبت ہی شطرنجی ہوگئی ۔مہدی کے انتقال کے بعد اس کی بیٹی علیہ کے دامن دولت سے وابستہ ہوگیا اور شاعر علیہ کہا جانے لگا۔علیہ کے فرمائشی موضوعات پر وہ شعر کہتا اور علیہ گاتی ۔علیہ خود بھی شاعر تھی اور اس کا مختصر دیوان صاحب الفہرست (۱: ۵۲۰) نے بیس اوراق میں دیکھا تھا،لیکن اس قطعے کے بارے میں مذکورہ بالا راویوں کا بیان ہے کہ ابوحفص شطرنجی کا ہے۔

صلاح الدین صفدی (ف ۷۶۴ھ) نے الوافی (۲۲: ۳۱۵) اور ابن شاکر کتبی (ف ۷۶۴ھ) نے فوات الوفیات (۳: ۱۳۶) میں ابوحفص کے حالات میں اس قطعے کو اسی کی جانب منسوب کیا ہے۔ موخر الذکر نے علیہ کے حالات میں بھی یہ قطعہ درج کیا ہے لیکن صرف اس حیثیت سے کہ اس نے یہ قطعہ گایا تھا۔ صفدی نے البتہ علیہ کے حالات میں (۲۲: ۲۲۸) کئی قطعے اس کی جانب منسوب کیے ہیں لیکن ان میں یہ قطعہ شامل نہیں ہے۔

ابوعلی قالی (ف ۳۵۶ھ) نے امالی (۱: ۲۲۴) میں نقل کیا ہے کہ ابراہیم بن عبداللہ الوراق نے یہ قطعہ ابن الانباری (ف ۳۲۸ھ) کو علیہ کے نام سے سنایا تھا۔ ابوعبید البکری (ف ۴۸۷ھ) نے امالی کی شرح (۱: ۵۱۶) میں اس کے دو شعر نقل کر کے لکھا کہ یہ قطعہ ابوحفص شطرنجی کا ہے۔ واضح رہے کہ ابوعبید کا مقصود صرف ان دو شعروں کی نسبت کی تصحیح نہیں ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے "وهو لأبی حفص الشطرنجی" لکھا، ورنہ "وهما ......" کہتے۔ صرف دو شعر نقل کرنے کی وجہ یہ ہے کہ آگے وہ متنبّی کے ایک شعر کی تعریف کرنا چاہتے ہیں جس میں اس نے ابوحفص کے مذکورہ دونوں شعروں کے مضمون کو نہایت خوبی سے سمو دیا ہے۔

اس موقع پر مولانا عبدالعزیز میمن نے ابوحفص شطرنجی پر یہ نوٹ لکھا ہے کہ "حصری ۱: ۱۱، واحدی اور عکبری میں یہ شعر عباس بن الاحنف کے ہیں اور صرف دوسرا شعر معجم الادباء ۵: ۴۲ میں اسحاق موصلی کی جانب منسوب ہے"۔

مولانا میمن کو تسامح ہوا۔ واحدی (ف ۴۶۸ھ) نے صاف لکھا ہے کہ "واحسن ابو حفص الشطرنجی في قوله"۔ اس کے بعد دونوں شعر نقل کیے ہیں۔ ملاحظہ ہو شرح دیوان المتنبی (ص ۴۹۸)۔

حصری (ف ۴۵۳ھ) کی زھر الآداب (۱: ۴۴) اور ابوالبقاء عکبری (ف ۶۱۶ھ) کی جانب منسوب شرح دیوان المتنبی (۲: ۳۰۴) میں البتہ یہ عباس بن الاحنف (ف ۱۹۲ھ) کی جانب منسوب ہیں۔

ابوالعباس جراوی (ف ۶۰۹ھ) نے الحماسۃ المغربیہ (۲: ۹۹۳) میں چاروں اشعار ابوحفص شطرنجی کے نام سے درج کرنے کے بعد مزید یہ لکھا ہے کہ ان کی نسبت عباس بن الاحنف

کی جانب بھی کی جاتی ہے۔

انہی مآخذ کی بنیاد پر ڈاکٹر عاتکہ خزرجی نے اس قطعے کو دیوان العباس بن الاحنف (ص ۶۲-۶۳) میں شامل کیا۔ لیکن راقم کے خیال میں عباس کی جانب اس کی نسبت درست نہیں اور بظاہر غلط فہمی پر مبنی ہے۔

اس کی ایک بڑی دلیل تو یہ ہے کہ ابوبکر صولی (ف ۳۳۶ھ) کے دادا اور مشہور شاعر اور انشا پرداز ابراہیم بن العباس صولی (ف ۲۴۳ھ) عباس بن الاحنف کے بھانجے تھے (وفیات الاعیان ۳: ۲۵) ابوبکر صولی نے عباس کے حالات پر ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ صاحب اغانی (۸: ۳۵۴-۳۷۵) نے عباس کے بیشتر حالات اسی کتاب سے نقل کیے ہیں۔ یہ مشہور قطعہ اگر عباس کا ہوتا تو ابوبکر کی کتاب میں اس کا ذکر ضرور آتا اور اغانی میں بھی وہ نقل ہوتا۔

صاحب اغانی نے ابوبکر سے حماد بن اسحاق کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ میرے دادا ابراہیم موصلی عباس کے اشعار کے دلدادہ تھے اور انہوں نے عباس کے بہت سے اشعار گائے تھے۔ اس کے بعد اس کے متعدد قطعے درج کیے ہیں جو ابراہیم موصلی نے گائے تھے۔ عباس بن الاحنف اپنے عہد کے ان چند شعراء میں سے تھا جن کی ساری شاعری غزلیہ ہے۔ زیر بحث قطعہ اگر عباس کا ہوتا تو جس طرح اسے علیہ نے گایا، ابراہیم موصلی بھی اسے گاتے اور اس کا ذکر ضرور آتا۔ ابوبکر صولی کا جو خاص رشتہ عباس سے تھا اس کی بنا پر وہ فخر کے ساتھ عباس کے حالات میں اس کا ذکر کرتے۔

ابوبکر صولی نے عباس بن الاحنف کا دیوان بھی حروف تہجی پر مرتب کیا تھا۔ صاحب الفہرست (۱: ۴۶۶) نے اس کا ذکر کیا ہے۔ خوش قسمتی سے اس کے تین نسخے محفوظ ہیں۔ ان کی بنیاد پر ڈاکٹر عاتکہ خزرجی نے یہ دیوان فرانسیسی مستشرق بلاشیر کی نگرانی میں مرتب کیا اور اس پر سوربون یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ صولی کے مرتبہ دیوان کے ان قلمی نسخوں میں زیر بحث قطعہ موجود نہیں ہے۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ عباس بن الاحنف کی جانب اس کی نسبت درست نہیں۔

غلط فہمی کی وجہ شاید یہ ہوئی کہ بعض کتابوں میں اس قطعے کے ساتھ عباس کا ایک قطعہ بھی

نقل ہوا ہے۔مثلاً ابوعلی تنوخی (ف ۳۸۴) نے الفرج بعدالشدۃ (۵:۴۳) میں اغانی سے علیہ کا زیر بحث قطعہ نقل کرنے کے بعد مضمون کی مناسبت سے عباس کا ایک قطعہ بھی درج کیا۔کیا عجب کہ بعد میں نقل نویسوں کی غلطی سے یہ قطعہ بھی عباس کی جانب منسوب ہوگیا ہو۔ مآخذ میں اس طرح کی بے احتیاطی کی مثالیں بہ کثرت ملتی ہیں۔

(۱۵) ص ۲۴۸:

**ثلاثة أيام هي الدهر كله		وما هن : الأمس واليوم والغد**

**وما القمر الا واحد غير أنه		يغيب ويأتي بالضياء المجدّد**

یہ دونوں شعر ابوالعلاء معری (ف ۴۴۹ھ) کے ایک قصیدے کے ہیں جو اس کے دیوان سقط الزند (ص ۸۹) میں شامل ہیں۔مولانا آزاد نے ابوالعلاء کے نام سے یہ شعر لکھے ہیں اس لیے ان کی تلاش مشکل نہ تھی چنانچہ حاشیہ نگار نے شروح سقط الزند کا حوالہ دیا لیکن اشعار کے متن میں انہیں معنی یا وزن کا کوئی نقص نظر آیا نہ غبار خاطر اور محولہ بالا ماخذ کے درمیان الفاظ کے واضح اختلاف کی جانب توجہ ہوئی۔

دوسرے شعر کا مصرعہ اولی ساقط الوزن ہے جب کہ پہلے شعر کا مصرعہ ثانی بے وزن بھی ہے اور بے معنی بھی۔اس کا سبب یہ ہے کہ مالک رام کے اڈیشن میں ایک لفظ چھوٹ گیا ہے۔طبع ثالث اور حالی پبلشنگ ہاؤس کی طبع اول میں یہ مصرعہ اس طرح ہے:

وما هن الّا الأمس واليوم والغد

اس صورت میں مصرعہ موزوں بھی ہے اور بامعنی بھی،لیکن اس کا متن اب بھی اصل کے مطابق نہیں اور اس میں قافیے کا ایک عیب بھی پایا جاتا ہے۔اس لیے کہ ترکیب میں "الأمس واليوم والغد" سب مرفوع ہیں جب کہ دوسرے شعر میں "المجدّد" مجرور کی صفت ہونے کی وجہ سے مجرور ہے۔گویا ایک شعر کا قافیہ مضموم اور دوسرے کا مکسور ہے۔اصطلاح میں اس عیب کو اقواء کہتے ہیں۔ابوالعلاء کے دیوان میں "غير الأمس" ہے۔اب "الأمس" مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے مجرور ہوا تو اس پر معطوف "اليوم والغد" بھی مجرور ہوگئے اور اقواء کا عیب جاتا رہا۔

دوسرے شعر میں وزن کا تقاضا ہے کہ "القمر" کی میم کو ساکن پڑھا جائے۔مالک رام

کے اڈیشن میں اس میں سکون کی علامت بھی لگائی ہے جو درست نہیں۔ضرورت شعری میں تسکین متحرک کے مواقع متعین ہیں۔ ملاحظہ ہو ابن عصفور اشبیلی کی کتاب ضرائر الشعر (ص ۸۴-۹۸)۔ یہاں میم پر سکون ایسا ہی ہے جیسے کوئی شاعر فلک اور قلم کو سکونِ لام سے باندھے۔تعجب یہ ہے کہ طبع اول اور طبع ثالث دونوں میں ''القمر'' ہی چھپا ہے۔ابوالعلاء کے دیوان میں اس کی جگہ ''البدر'' ہے۔

افسوس کہ مالک رام کے اڈیشن میں اس شعر میں بھی لفظ ''یغیب'' کے پہلے حرف پر پیش لگا دیا اس طرح یہ شعر بے معنی ہوگیا۔

(۱۶) ص ۲۴۹:

ومتی یساعدنا الوصال و دهرنا یومان یوم نوی ویوم صدود

غبار خاطر میں شاعر کا نام مذکور نہیں اور مرتب کو یہ شعر کہیں مل نہ سکا اس لیے اس پر کوئی حاشیہ بھی موجود نہیں۔

یہ شعر مشہور شاعر بحتری (ف ۲۸۴ھ) کا ہے۔ملاحظہ ہو دیوان البحتری (۲: ۶۹۸)۔

(۱۷) ص ۲۸۳:

سارت مشرّقة وسرت مغرّبًا شتّان بین مشرّق و مغرّب

یہ شعر بھی مرتب کو مل نہ سکا اس لیے اس پر کوئی حاشیہ موجود نہیں ہے۔

ابوحیان توحیدی (ف ۴۱۴ھ) نے البصائر والذخائر (۸: ۱۷۸) میں تین اشعار کا ایک قطعہ نقل کیا ہے۔یہ اس قطعے کا دوسرا شعر ہے اور مصرعہ اولی کا متن اس طرح ہے:

بکرت مشرّقة ورحت مغرّبًا

کتاب مذکور اس شعر کا سب سے قدیم حوالہ ہے، بلکہ یہ قطعہ بھی کسی اور کتاب میں نظر نہیں آیا۔شاعر کا نام ابوحیان نے لکھا نہ کسی اور نے۔

بیشتر مآخذ میں مصرعہ اولی کے الفاظ وہی ہیں جو غبار خاطر میں ہیں مثلاً:

۱-صلاح الدین صفدی (ف ۷۶۴ھ) کی الوافی (۶: ۴۲)۔

۲-سبکی (ف ۷۷۱ھ) کی طبقات الشافعیہ (۴: ۲۲۸)۔

۳-ابن ابی حجہ (ف ۷۷۶ھ) کی دیوان الصبابۃ (ص ۲۶۱)۔

۴-نجم الدین غزی (ف ۱۰۶۱ھ) کی الکواکب السائرۃ (۲۲:۲)۔

۵-یوسف بدیعی (ف ۱۰۷۳ھ) کی الصبح المنبی (۸۸:۲)۔

البتہ لسان الدین ابن الخطیب (ف ۷۷۶ھ) نے الاحاطہ فی اخبار غرناطہ (۲۳۰:۱) اور حسن الیوسی (ف ۱۱۰۲ھ) نے زھر الاکم (۲۲۲:۱) میں "**راحت** ...... **ورحت** ......" کے الفاظ نقل کیے ہیں۔

غبار خاطر میں عربی کا یہ آخری شعر ہے جو کتاب کے آخری صفحے پر آیا ہے۔ اور عجیب بات ہے کہ اس کے آخری لفظ کو "**مَغرَب**" فتح میم وراء کے ساتھ لکھا گیا، اس طرح معنی اور وزن کوئی بھی سلامت نہیں رہ سکا! مصرعہ اولی میں "**مشرقة**" اور "**مغربًا**" کو راے مشددہ کے ساتھ ٹھیک لکھا لیکن وہی لفظ جب دوسرے مصرعے میں آئے تو معلوم نہیں کیوں "**مشرق**" کو تو بخش دیا یعنی اعراب کے بغیر لکھا البتہ "**مغرب**" کو زیر وزبر کر دیا!

غبار خاطر کے عربی اشعار کے بعد حضرت علیؓ کے ایک مقولے اور ایک ضرب المثل کی تصحیح بھی ضروری معلوم ہوتی ہے:

(۱) ص ۱۰۸: **لو کشف الغطاء لم ازددت یقینًا**

مرتب نے حاشیے میں اس مقولے کا ترجمہ کیا، پھر لکھا کہ یہ حضرت علیؓ کی طرف منسوب ہے، اس کے بعد شرح نہج البلاغہ اور حلیۃ الاولیاء کا حوالہ دیا، لیکن اس کا اندازہ انہیں نہ ہوسکا کہ جس مقولے پر وہ یہ محنت کر رہے ہیں اس کا متن ہی درست نہیں۔

عربی زبان کا مبتدی بھی جانتا ہے کہ "**لم**" فعل مضارع پر داخل ہوتا ہے اور یہاں "**ازددت**" فعل ماضی ہے اس لیے یہ ترکیب قطعی طور پر غلط ہے۔ اب متن کی صحت کی دو ہی صورتیں ہیں، یا تو "**لم ازدد**" ہو یا "**لما ازددت**" یعنی لام الجواب کے بعد ما نافیہ۔ اقرب یہ ہے کہ مولانا آزاد نے کسی کتاب میں موخر الذکر صورت میں پڑھا ہوگا۔ "**لما**" کی جگہ "**لم**" یہاں کاتب کی غلطی ہے لیکن مالک رام کے اڈیشن سے پہلے کی اشاعتوں کے کاتب کی، کیوں کہ طبع ثالث میں بھی یہ غلطی موجود ہے۔ تاہم مالک رام نے جب طبع ثالث کا متن پڑھا، ترجمہ

کیا، مآخذ میں اسے تلاش کیا اور جن کتابوں کا حوالہ دیا ان میں متن صحیح صورت میں موجود ہے تو پھر انہیں (یا ان کے معاونین کو) یہ فاش غلطی کیوں نظر نہ آئی؟

یہ مقولہ عام طور پر حضرت علیؓ کی جانب منسوب ہے۔ حاشیہ نگار نے شرح نہج البلاغہ کے ایک مقام کا حوالہ دیا ہے۔ شرح مذکور میں چار اور مقامات پر بھی یہ آیا ہے (۷:۲۵۳؛ ۱۰:۱۴۲؛ ۱۱: ۱۷۹،۲۰۲؛ ۱۳: ۸)۔ مزید ملاحظہ ہو: ثعالبی (ف ۴۲۹ھ) کی الاعجاز والایجاز (ص ۳۴)، صلاح الدین صفدی (ف ۷۶۴ھ) کی الوافی بالوفیات (۸: ۱۱۶) تاج الدین سبکی (ف ۷۷۱ھ) کی طبقات الشافعیۃ (۶: ۶۱)۔

ابو طالب مکی (ف ۴۲۹ھ) نے قوت القلوب (۲: ۱۶۹) میں یہی مقولہ ربیع بن خُثَیم (ف ۶۱ھ) کی جانب منسوب کیا ہے۔ امام غزالی (ف ۵۰۵ھ) کی احیاء العلوم (۱: ۱۷۱) میں بھی ربیع کی جانب منسوب ہے۔ غالباً امام غزالی کا ماخذ قوت القلوب ہے۔

رسالۂ قشیریہ (۱: ۳۱۹) میں عامر بن عبد قیس (ف تقریباً ۷۰ھ) کی جانب منسوب ہے اور ابن مفلح (ف ۷۶۳ھ) نے الآداب الشرعیہ (۱: ۲۷۹) میں حضرت ابوبکرؓ کی طرف منسوب کیا ہے۔

مقولے کے متن میں مندرجہ بالا سارے مآخذ میں "ما ازددت" لام الجواب کے بغیر آیا ہے۔ عام قاعدہ بھی یہی ہے کہ لو شرطیہ کا جواب اگر منفی ہو تو اس پر لام داخل نہیں ہوتا لیکن علماء اور ادباء کے کلام میں اس کے خلاف بھی مثالیں ملتی ہیں۔ خود امام غزالی نے احیاء العلوم (۴: ۳۵۳) میں ایک جگہ اس مقولے کو اپنی عبارت میں تصرف کے ساتھ استعمال کیا تو لام الجواب کے ساتھ اس طرح لکھا: "**لو کشف الغطاء لما ازداد یقینًا**"۔ اس لیے ممکن ہے غبار خاطر میں لام الجواب مولانا آزاد کا تصرف ہو۔

(۲) ص ۱۷۰: **و صاحب البیت أدری بما فیها**

مرتب نے حاشیے میں اس کہاوت کا ترجمہ لکھا لیکن یہاں بھی انہیں متن کی غلطی نظر نہ آئی۔ صحیح لفظ "فیه" ہے اس لیے کہ ضمیر کا مرجع لفظ "البیت" عربی میں مذکر ہے۔

طبع ثالث اور طبع اول میں بھی یہ غلطی موجود ہے۔ اگر مولانا آزاد کے مسودے میں بھی

ایسا ہی تھا تو اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ مولانا کا ذہن لفظ ''الـــدار'' کی طرف چلا گیا جو مونث سماعی ہے۔ قلم کا سہو بھی ہو سکتا ہے، لیکن مرتب کی نگاہ اس واضح غلطی پر کیوں نہیں ٹھہری؟

مضمون کے آخر میں حواشی کے دو مقامات پر بھی گفتگو کی جاتی ہے اس لیے کہ ان کا تعلق بھی عربی اشعار سے ہے۔

(۱) ص ۳۲۳ پر حاشیہ نگار نے شیخ محمد عبدہ کے حالات میں ان کے یہ دو شعر نقل کیے ہیں:

ولست أبا لي أن يقال محمد أبلّ أو اكتظت عليه المآتم

ولكن دينًا أردت صلاحه أخاف أن تقضي عليه العمائم

اور خدا معلوم ان شعروں میں انہیں کیا تقدس نظر آیا کہ ان پر قرآن مجید کی طرح اعراب لگانے کی کوشش کی، یہ اور بات کہ دوسرے شعر کے دونوں مصرعے ساقط الوزن اور غلط لکھے۔

مصرعہ اولی میں ''لکن'' کی نون پر سکون کی علامت لگائی حالانکہ اس پر تشدید ہے۔ ''اردت'' سے پہلے ''قد'' چھوٹ گیا ہے۔ ''اردت'' کی دال پر تشدید لگائی ہے جب کہ اسے ''ت'' پر ہونا چاہیے۔

مصرعہ ثانی میں ''اخاف'' کی جگہ ''احاذر'' ہے۔ ''تقضي'' کو فتح یاء کے ساتھ لکھنا بھی درست نہیں بلکہ ضرورت شعری کی وجہ سے حرف علت ساکن ہے۔ پورا شعر یوں ہے:

ولكنّ دينًا قد أردتُ صلاحه أحاذر أن تقضي عليه العمائم

شیخ محمد عبدہ کا قصیدہ ان کی حیات ہی میں شائع ہو گیا تھا۔ سید رشید رضا فرماتے ہیں کہ مصرعہ اولی اخبارات میں اسی طرح چھپا تھا لیکن اس کی اصل صورت یہ ہے:

ولكنّه دين أردت صلاحه

ملاحظہ ہو مجلۃ المنار شمارہ یکم ذوالحجہ ۱۳۲۳ھ مطابق ۲۶ جنوری ۱۹۰۶ء۔

(۲) غبار خاطر میں ص ۶۲ پر مولانا نے حافظ کا یہ مصرعہ نقل کیا ہے:

کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا

اس پر مرتب کی جانب سے یہ حاشیہ لکھا گیا ہے:

''یہ حافظ کی سرِ دیوان غزل کا مصرع ثانی ہے جس سے اس نے یزید بن معاویہ کے

مصرعے کی تضمین کی ہے، یزید کا شعر ہے:

أنا المسموم وما عندی بترياق ولا راق

ألا يا أيها الساقي أدر كأسًا وناولها"

حاشیہ نگار نے یزید کے شعر کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ افسوس کہ میرے سامنے یہاں فارسی ماخذ نہیں ہیں، لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے یزید کی جانب منسوب اس شعر کا دوسرا مصرعہ اس طرح منقول ہے:

أدر كأسًا وناولها ألا يا أيها الساقي

گویا یہ شعر کسی قصیدے کا مطلع ہے۔ بہاء الدین عاملی (ف ۱۰۳۱ھ) نے کشکول (۱:۹ ۱۷-۱۸۰) میں اپنا ایک قطعہ نقل کیا ہے اس میں بھی اس مصرعے کی تضمین اسی صورت میں کی ہے۔

حاشیہ نگار عام طور پر اشخاص کے لیے خواہ مسلم ہوں یا غیر مسلم اور خواہ کسی پیشے یا طبقے سے تعلق رکھتے ہوں، تعظیم کے صیغے استعمال کرتے ہیں لیکن یزید کے مصرعے کی تضمین پر وہ اس قدر برہم ہوئے کہ خواجہ حافظ کے لیے "انہوں نے" کی جگہ "اس نے" کے الفاظ استعمال کیے۔

علامہ اقبال کی خوش قسمتی کہ موصوف کی برہمی سے محفوظ رہے۔ شاید انہیں خبر نہ تھی کہ یزید کے "بے مثال" شعر کا پہلا مصرعہ جو حافظ شیرازی کی "دست برد" سے بچ رہا تھا، رائگاں نہیں گیا، اور وہ اقبال لاہوری کے کام آیا، زبور عجم (ص ۳۸) میں فرماتے ہیں:

دلِ گیتی انا المسموم ، انا المسموم فریادش

خرد نالاں کہ ما عندی بتریاق ولا راقی

حقیقت یہ ہے کہ یہ شعر اور یزید بن معاویہ کی جانب اس کی نسبت سراسر جھوٹ ہے، اور جس شخص نے یہ افسانہ گھڑا ہے وہ عربی زبان کے قواعد اور عربی شاعری کی روایت دونوں سے بے بہرہ تھا۔

پہلی بات یہ کہ حاشیہ نگار نے عربی مصرعے کو فارسی میں پڑھا۔ اگر وہ "وما عندی" کو عربی میں پڑھتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ مصرعہ وزن سے خارج ہے۔ عربی میں واو عطف مفتوح ہوتا ہے جیسا کہ "ولا راق" میں ہے۔ عربی میں اس مصرعے کو موزوں بنانے کے لیے واو کو حذف

کرنا ضروری ہے، یعنی **أنا المسموم ما عندی** ......"۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ مصرعہ عربی زبان کے قواعد کے اعتبار سے غلط ہے۔ جملہ "**وما عندی بتریاق ولا راق**" میں ما نافیہ ہے، "عندی" خبر مقدم ہے، اور "بتریاق" ما نافیہ کا اسم ہے عربی میں "لیس" کی طرح ما نافیہ کی خبر منصوب ہوتی ہے یا مجرور بالباء۔ زیر بحث جملے میں "تریاق" اسم ہے اس لیے مرفوع ہونا چاہیے۔ یعنی: "وما عندی تریاقٌ"۔ "بتریاق" کہنا کسی طور درست نہیں ہے۔

اصل میں جس شخص نے یہ شعر بنایا اسے "راقٍ" کا قافیہ مطلوب تھا، لیکن عربی سے نابلد ہونے کی وجہ سے وہ یہ سمجھا کہ "راقٍ" مجرور ہے۔ اب اگر "تریاقٌ" (مرفوع) کہیں تو "راق" کی قاف پر بھی ضمہ آئے گا اور اس صورت میں وہ "الساقی" کا ہم قافیہ نہیں بن سکتا۔ چنانچہ اس نے "تریاق" پر باء الجر داخل کر دی۔ حالانکہ "راق" اسم منقوص ہونے کی وجہ سے مرفوع اور مجرور دونوں حالتوں میں "راق" رہے گا اور قافیہ ہو تو "راق" یا "راقی" لکھا جائے گا اور "راقی" پڑھا جائے گا۔ اس لیے "تریاقٌ" پر اس کا عطف درست ہے۔ اور وہ "الساقی" کا ہم قافیہ بن سکتا ہے۔

اب اس شخص کو عربی زبان کا مزید علم ہوتا تو "عنديْ" کی یائے متکلم کو فتحے کے ساتھ یوں پڑھتا:

أنا المسموم ما عنديَ ترياقٌ ولا راقِ

اس طرح مصرعہ موزوں بھی ہو جاتا اور قواعد کے مطابق بھی۔ مگر وہ جو میر نے کہا تھا:

عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے

تیسری بات یہ ہے کہ یہ شعر ہزج مثمن میں ہے اور یہ بحر عربی میں سرے سے مستعمل نہیں۔ عربی عروض کے دائرۃ المشتبہ میں ہزج کا وزن مفاعیلن چھ بار آتا ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ صراحت بھی کی جاتی ہے کہ عربی شاعری میں مستعمل صرف چار بار ہے۔ اکا دکا اشعار عروض کی کتابوں میں ہزج مسدس میں جو ملتے ہیں وہ بعض متاخرین نے شاید مثال کے طور پر وضع کیے ہیں۔ لیکن ہزج مثمن کی مثال عرب شعراء کے کلام میں نہیں ملتی۔ بعض ایرانی محققین نے بھی اس جانب توجہ دلائی ہے۔

ہاں، زیر بحث شعر کو اگر چار مصرعوں میں تقسیم کر دیا جائے تو اس کی نسبت کسی عرب شاعر کی جانب درست ہوسکتی ہے:

أنـا الـمسـمـوم مـا عـنـدِ يَ تـــريـــاقٌ ولاراقِ

أدر كـــأسًـا ونـــاولـهـا ألا يـــا أيـهـا الســاقـي

لیکن دوسرے شعر میں زبان کی ایک خامی ہنوز باقی رہتی ہے۔عربی زبان میں ''ألا'' حرف استفتاح وتنبیہ ہے۔یعنی اس کی جگہ جملے کے شروع میں ہوتی ہے اور اس کا مطلب مخاطب کو پہلے سے اپنی بات کی جانب متوجہ کرنا ہوتا ہے۔مثلاً قرآن مجید میں ارشاد ہے:

'' اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ السُّفَھَآءُ '' (بقرہ:۱۲)

منادی کے ساتھ ''اَلا'' کے استعمال کے لیے ملاحظہ ہو خنساء (ف ۲۴ھ) کا شعر (دیوان:۱۷۷):

ألا يـا عيـن فـانهـمـري بـغـزر و فيـضـي عبـرة من غيـر نـزر

ابن الدمینہ (ف تقریباً ۱۸۰ھ) کہتا ہے (دیوان:۸۵، دیوان مجنون لیلی:۸۹)

ألا يا صبا نجد متى هجت من نجد لقد زادني مسراک وجدًا على وجد

مالک بن الصمصامہ الجعدی کہتا ہے (الاغانی ۲۲:۸۴):

ألا أيهـا الســاقـي الـذي بلَّ دلوه بقريان يسقي هل عليک رقيب

چوتھی بات یہ ہے کہ عربی ادب، تاریخ اور تذکرے کی کتابوں میں کہیں اس شعر کا ذکر نہیں ملتا حالانکہ ان کے مصنّفین کی ایک قابل ذکر تعداد شیعہ فرقے سے تعلق رکھتی تھی اور یہ شعر ان کے مفید مطلب تھا۔

یزید بن معاویہ بظاہر یزید کم گو شاعر تھا، اس کے کلام کا اولین مجموعہ مرزبانی (ف ۳۸۴ھ) نے مرتب کیا تھا۔قاضی ابن خلکان (ف ۶۸۱ھ) نے اس کا جو نسخہ دیکھا تھا وہ تقریباً تین کرّاسوں میں تھا۔ایک کراس عام طور پر دس ورق کا ہوتا تھا، گویا یہ نسخہ لگ بھگ ساٹھ صفحات پر مشتمل تھا۔ ابن خلکان نے مزید لکھا ہے کہ مرزبانی کے بعد اوروں نے بھی یزید کا کلام جمع کیا لیکن اس میں بہت سے اشعار دوسروں کے داخل کر دیے۔ابن خلکان یزید کی شاعری کے اس قدر دلدادہ تھے کہ

۶۳۳ھ میں (اس وقت ان کی عمر ۳۵ سال تھی) یزید کا دیوان یاد کرلیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ کون سے اشعار واقعی یزید کے ہیں، کون سے یزید کی جانب غلط طور پر منسوب ہیں، اور ان کے اصل قائل کون ہیں، ان سب امور کی تحقیق کر لی تھی ۔ کہتے ہیں کہ طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو وہ یہ ساری تفصیل بیان کرتے۔ ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں یزید کے حالات نہیں لکھے ہیں۔ اس کی شاعری اور دیوان کے بارے میں ان کے یہ تاثرات اور معلومات مرزبانی کے حالات (۴:۳۵۴) میں ملتے ہیں۔ بہرحال یہ معلوم نہ ہوسکا کہ ابن خلکان نے اپنی یہ تحقیق مرتب کی تھی یا نہیں۔

ابن شاکر کتبی (ف ۷۶۴ھ) نے فوات الوفیات (۴: ۳۲۸) میں یزید کے دیوان کا تذکرہ کیا ہے اور ساتھ ہی یہ لکھا ہے کہ اس میں کم ہی اشعار ایسے ہیں جن کی نسبت یزید کی جانب درست ہو۔ ابن شاکر کے بیان کے مطابق جمال الدین قفطی (ف ۶۴۶ھ) نے یزید اور اس کے ہم نام شعراء کا مجموعۂ کلام مرتب کیا تھا۔

حمیدی (ف ۴۸۸ھ) نے جذوۃ المقتبس (ص ۳۶۳) میں ابن الصفار (ف ۳۵۲ھ) کے حالات میں لکھا ہے کہ اندلس کے اموی خلیفہ الحکم المستنصر کی فرمائش پر انہوں نے مشرق اور اندلس کے اموی خلفاء کا کلام اکٹھا کیا تھا۔ ظاہر ہے اس مجموعے میں بھی یزید کا کلام ضرور شامل رہا ہوگا۔

اس وقت مذکورہ مجموعوں میں سے کسی کا پتہ نہیں ۔ البتہ اسکوریال میں ساتویں صدی ہجری کا ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے جس میں یزید کے بارہ قطعات پائے جاتے ہیں ۔ اس کا مرتب نامعلوم ہے۔ ممکن ہے یہ اسی طرح کا کوئی مجموعہ ہو جس کی جانب ابن خلکان نے اشارہ کیا ہے۔ ۱۹۲۲ء میں جرمن مستشرق پاول شوارتس PAUL SCHWARZ نے یہ قطعے جرمن زبان میں ترجمے کے ساتھ شائع کردیے تھے۔ فرانسیسی مستشرق پادری ہنری لامنس HENRY LAMENS نے (جس کی آخری زندگی بیروت میں گزری) مجلۃ المشرق (جلد ۲۲ شمارہ ۳، ۱۹۲۴ء) میں مذکورہ مجموعے پر تنقید کی تھی ۔ اس کے نزدیک یزید کی جانب ان قطعوں کی نسبت درست نہیں ۔ دوسرے مستشرقین نے بھی اس کے بارے میں شک کا اظہار کیا ہے۔

یزید کے کچھ اشعار ۱۹۲۶ء میں اطالوی مستشرق GEORGE DELLA VIDA نے

بھی شائع کیے۔ مذکورہ اشاعتوں کے بارے میں تفصیل فواد سزکین کی تاریخ التراث العربی جلد دوم، حصہ سوم (ص ۴-۵) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

۱۹۸۲ء میں ڈاکٹر صلاح الدین المنجد نے ''شعر یزید بن معاویۃ بن ابی سفیان'' کے نام سے یزید کے اشعار کا ایک مجموعہ شائع کیا۔ اس میں انہوں نے پہلے وہ اشعار درج کیے جن کی نسبت یزید کی جانب ان کے نزدیک راجح قرار پائی۔ اس حصے میں تقریباً ستر اشعار ہیں۔ دوسرا حصہ ان اشعار کے لیے مخصوص ہے جو یزید کی جانب منسوب کیے جاتے ہیں لیکن یہ نسبت مشکوک ہے۔ اس حصے میں بھی پہلے وہ اشعار رکھے ہیں جو اسکوریال کے مذکورہ قلمی نسخے میں پائے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی ان کے مشکوک ہونے کے اسباب بھی بیان کیے ہیں۔ یہ بارہ قطعے اٹھاون اشعار پر مشتمل ہیں۔ اس کے بعد مزید چونتیس اشعار مختلف مآخذ سے نقل کیے ہیں۔ اس طرح راجح، مشکوک یا قطعی طور پر غلط منسوب اشعار کی مجموعی تعداد اس دیوان میں (۱۶۲) ہوتی ہے، اور ان میں ''انا المسموم'' والے شعر کا کہیں پتہ نہیں ہے جسے خواجہ حافظ کے کسی کم سواد حاسد نے گھڑ کر یزید کی جانب منسوب کر دیا اور اہلی شیرازی اور کاتبی نیشاپوری جیسے فارسی شعراء اس پر یقین کر بیٹھے اور خواب میں حافظ سے سوال و جواب کرنے لگے پھر کسی نے ان کی جانب سے معذرت پیش کی اور کوئی طعن و تشنیع پر اتر آیا!

راقم نے استاذ مجتبیٰ مینوی کے حوالے سے کہیں پڑھا تھا کہ انہوں نے امیر خسرو کے مندرجہ ذیل شعر کا ذکر کیا ہے:

شراب لعل باشد قوت جاں ہا قوّت دلھا
الا یا ایہا الساقی ادر کأسًا و ناولھا

امیر خسرو کا انتقال خواجہ حافظ کی پیدائش سے تقریباً دو سال قبل ۷۲۵ھ میں ہوا، اس لیے عجب نہیں کہ حافظ نے امیر خسرو کے مصرعے کی تضمین کی ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

فہرست مآخذ

الآداب الشرعیۃ والمنح المرعیۃ، شمس الدین محمد بن مفلح حنبلی، عالم الکتب، بیروت۔
الابانۃ عن سرقات المتنبی، عمیدی، تحقیق ابراہیم دسوقی، دارالمعارف، قاہرہ، ۱۹۶۱ء۔

ابجد العلوم، صدیق حسن خان، دار ابن حزم، بیروت، ۲۰۰۲ء۔
احیاء العلوم، ابوحامد غزالی، دار المعرفہ، بیروت۔
اخبار ابی تمام، ابوبکر صولی، تحقیق خلیل محمود عساکر و محمد عبدہ عزام و نظیر الاسلام ہندی، لجنۃ التالیف والترجمہ والنشر، قاہرہ، ۱۹۳۷ء۔
اخلاق الوزیرین، ابوحیان توحیدی، تحقیق محمد بن تاویت طنجی، المجمع العلمی العربی، دمشق، ۱۹۶۵ء۔
الاعجاز والایجاز، ثعالبی، مکتبۃ القرآن، قاہرہ۔
اغاثۃ اللہفان فی مصاید الشیطان، ابن القیم، تحقیق محمد عزیر شمس، دار عالم الفوائد، مکہ مکرمہ، ۱۴۳۲ھ۔
الاغانی، ابوالفرج اصفہانی، دار الثقافہ، بیروت، ۱۹۵۵-۱۹۶۵ء۔
الامالی، ابوعلی قالی، دار الکتب المصریہ، قاہرہ، ۱۹۲۶ء۔
امالی المرتضی، تحقیق محمد ابوالفضل ابراہیم، دار الفکر العربی، قاہرہ، ۱۹۹۸ء۔
الامثال الصادرۃ من بیوت الشعر، حمزہ اصفہانی، تحقیق احمد بن محمد الضبیب، دار المدار الاسلامی، بیروت، ۲۰۰۹ء۔
البدایہ والنہایۃ، ابن کثیر، دار ہجر، جیزہ، ۱۹۹۷ء۔
البدیع فی نقد الشعر، اسامۃ بن منقذ، تحقیق احمد احمد بدوی و حامد عبد المجید، وزارۃ الثقافۃ والارشاد القومی، قاہرہ، ۱۹۶۰ء۔
البرہان فی علوم القرآن، زرکشی، تحقیق محمد ابوالفضل ابراہیم، دار المعرفہ، بیروت۔
البصائر والذخائر، ابوحیان توحیدی، تحقیق وداد القاضی، دار صادر، بیروت، ۱۹۸۸ء۔
بہجۃ المجالس، ابن عبد البر، تحقیق محمد مرسی الخولی، دار الکتب العلمیہ، بیروت۔
البیان والتبیین، جاحظ، تحقیق عبد السلام ہارون، مکتبۃ الخانجی، قاہرہ، ۱۹۸۵ء۔
تاج العروس، سید مرتضی زبیدی بلگرامی، وزارۃ الاعلام، کویت (۴۰ جلدیں)۔
تاریخ اربل، ابن المستوفی، تحقیق سامی الصفار، وزارۃ الثقافۃ، بغداد، ۱۹۸۰ء۔
تاریخ التراث العربی، فؤاد سزکین، ترجمہ عرفہ مصطفیٰ و سعید عبد الرحیم، جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ، ریاض، ۱۹۸۳ء۔

تزیین الاسواق فی اخبار العشاق، داود بن عمر انطاکی، تحقیق محمد التونجی، دار عالم الکتب، بیروت۔
التشبیہات، ابن ابی عون، تحقیق عبدالمعید خان، کیمبرج یونیورسٹی پریس، ۱۹۵۰ء۔
التعرف لمذہب اھل التصوف، ابوبکر کلاباذی، مرتبہ آربری، مکتبۃ الخانجی، قاہرہ، ۱۹۹۴ء۔
التمثیل والمحاضرۃ، ابومنصور ثعالبی، تحقیق عبدالفتاح الحلو، الدار العربیہ للکتاب، ۱۹۸۳ء۔
ثمرات الاوراق، ابن حجہ حموی، مکتبۃ الجمھوریۃ العربیۃ، قاہرہ۔
جذوۃ المقتبس، حمیدی، تحقیق بشار عواد معروف، دار الغرب الاسلامی، تونس، ۲۰۰۸ء۔
الحماسۃ البصریۃ، صدرالدین بصری، تحقیق عادل سلیمان جمال، مکتبۃ الخانجی، قاہرہ، ۲۰۰۰ء۔
الحماسۃ الشجریۃ، ابن الشجری، تحقیق عبدالمعین ملوحی واسماء حمصی، وزارۃ الثقافۃ، دمشق، ۱۹۷۰ء۔
الحماسۃ المغربیہ، ابوالعباس جراوی، تحقیق محمد رضوان الدایۃ، دارالفکر، دمشق، ۱۹۹۱ء۔
الحیوان، جاحظ، تحقیق عبدالسلام ہارون، دار احیاء التراث العربی، بیروت۔
خاص الخاص، ثعالبی، تحقیق صادق نقوی، دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد، ۱۹۸۴ء۔
خزانۃ الادب، عبدالقادر بغدادی، تحقیق عبدالسلام ہارون، مکتبۃ الخانجی، قاہرہ۔
الداء والدواء، ابن القیم، تحقیق محمد اجمل اصلاحی، دار عالم الفوائد، مکہ مکرمہ، ۱۴۲۹ھ۔
دلیل الفالحین لطرق ریاض الصالحین، محمد بن علی بن محمد علان صدیقی، دارالمعرفہ، بیروت، ۲۰۰۴ء۔
دیوان البحتری، تحقیق حسن کامل صیرفی، دارالمعارف، قاہرہ، ۱۹۷۷ء۔
دیوان الخنساء، تحقیق انور ابوسویلم، دار عمار، اردن، ۱۹۸۸ء۔
دیوان ابن دراج القسطلی، تحقیق محمود علی مکی، المکتب الاسلامی، دمشق، ۱۹۶۱ء۔
دیوان ابن الدمینہ، تحقیق احمد راتب النفاخ، دار العروبہ، قاہرہ، ۱۹۵۹ء۔
دیوان ابن سناء الملک، تحقیق محمد ابراہیم نصر، وزارۃ الثقافۃ، قاہرہ، ۱۹۶۹ء۔
دیوان الشافعی، مرتبہ مجاہد مصطفیٰ بہجت، دارالقلم، دمشق، ۱۹۹۹ء۔
دیوان الشافعی، مرتبہ احسان عباس، دار صادر، بیروت، ۱۹۹۶ء۔
دیوان الصاحب ابن عباد، تحقیق محمد حسن آل یاسین، دارالقلم، بیروت، ۱۹۷۴ء۔
دیوان الصبابۃ، ابن ابی حجلہ، دار و مکتبۃ الہلال، بیروت، ۱۹۹۹ء۔

دیوان العباس بن الاحنف، تحقیق عاتکہ خزرجی، دار الکتب المصریہ، قاہرہ، ۱۹۵۴ء۔
دیوان عدی بن الرقاع العاملی، تحقیق نوری حمودی قیسی وحاتم صالح الضامن، المجمع العلمی العراقی، بغداد، ۱۹۸۷ء۔
دیوان ابن عربی، دار صادر، بیروت، ۲۰۰۳ء۔
دیوان المتنبی، تحقیق عبدالوہاب عزام، لجنۃ التالیف والترجمہ والنشر، قاہرہ، ۱۹۴۴ء۔
دیوان مجنون لیلی، مرتبہ عبدالستار فراج، مکتبۃ مصر، قاہرہ، ۱۹۷۹ء۔
دیوان المعانی، ابوہلال عسکری، تحقیق النبوی شعلان، موسسۃ العلیاء، قاہرہ، ۲۰۰۵ء۔
دیوان ابی نواس، باہتمام احمد عبدالمجید غزالی، قاہرہ، ۱۹۵۳ء۔
دیوان ابی نواس، تحقیق ایوالڈ واگنر، جمعیۃ المستشرقین الالمانیہ، بیروت، ۲۰۰۱ء تا ۲۰۰۶ء۔
الذیل علی تاریخ بغداد، ابن النجار، دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد، ۱۹۷۸ء۔
ربیع الابرار، زمخشری، موسسۃ الاعلمی، بیروت، ۱۴۱۲ھ۔
الرسالۃ القشیریۃ، تحقیق عبدالحلیم محمود ومحمود بن الشریف، دار المعارف، قاہرہ، ۱۹۹۵ء۔
روض الاخیار المنتخب من ربیع الابرار، محمد بن قاسم حنفی، دار القلم العربی، حلب، ۱۴۲۳ھ۔
زھر الآداب، ابواسحاق حصری، تحقیق محمد ابوالفضل ابراہیم، دار الجیل، بیروت۔
زھر الاکم، نورالدین الیوسی، تحقیق محمد حجی ومحمد الاخضر، المغرب، ۱۹۸۱ء۔
الزھرۃ، ابوبکر محمد بن داود اصبہانی، تحقیق ابراہیم سامرائی، مکتبۃ المنار، اردن، ۱۹۸۵ء۔
سقط الزند، ابوالعلاء معری، دار بیروت، ۱۹۸۰ء۔
سمط اللآلی، ابوعبید بکری، تحقیق عبدالعزیز میمنی، لجنۃ التالیف والترجمہ والنشر، قاہرہ، ۱۹۳۶ء۔
شذرات الذھب، ابن عماد حنبلی، تحقیق محمود ارناؤوط، دار ابن کثیر، دمشق، ۱۹۸۶ء۔
شرح دیوان الحماسۃ، مرزوقی، تحقیق عبدالسلام ہارون واحمد امین، لجنۃ التالیف والترجمہ والنشر، قاہرہ، ۱۹۶۷ء۔
شرح دیوان المتنبی (منسوب الی العکبری) تحقیق مصطفیٰ السقا والابیاری وشبلی، دار المعرفۃ، بیروت۔
شرح دیوان المتنبی، واحدی، باہتمام فریدریخ دیتریصی، برلن، ۱۸۶۱ء۔

شرح مقامات الحریری، ابوالعباس شریشی، تحقیق محمد ابوالفضل ابراہیم، المکتبۃ العصریۃ، بیروت، ۱۹۹۸ء۔
شرح نہج البلاغۃ، ابن ابی الحدید، تحقیق محمد ابوالفضل ابراہیم، داراحیاء الکتب العربیۃ، قاہرہ، ۱۹۵۹ء تا ۱۹۶۴ء۔
شعر نصیب بن رباح، مرتبہ داود سلوم، مطبعہ الارشاد، بغداد، ۱۹۶۷ء۔
شعر یزید بن معاویۃ بن ابی سفیان، مرتبہ صلاح الدین المنجد، دارالکتاب الجدید، بیروت، ۱۹۸۲ء۔
الصبح المنبی عن حیثیۃ المتنبی، یوسف بدیعی، المطبعۃ العامریۃ الشرفیۃ، قاہرہ، ۱۳۰۸ھ۔
ضرائر الشعر، ابن عصفور، تحقیق السید ابراہیم محمد، دارالاندلس، بیروت۔
طبقات الشافعیۃ الکبری، سبکی، تحقیق محمود طناحی وعبدالفتاح محمد الحلو، ھجر للطباعۃ والنشر، جیزہ، ۱۴۱۳ھ۔
العمدۃ فی محاسن الشعر وآدابہ، ابن رشیق، تحقیق محمد قرقزان، دارالمعرفۃ، بیروت، ۱۹۸۸ء۔
عیون الاخبار، ابن قتیبہ، دارالکتب المصریۃ، قاہرہ۔
الفرج بعد الشدۃ، ابوعلی تنوخی، تحقیق عبود شالجی، دارصادر، بیروت، ۱۹۷۸ء۔
الفہرست، ابن الندیم، تحقیق ایمن فؤاد سید، موسسۃ الفرقان للتراث الاسلامی، لندن، ۲۰۰۹ء۔
فوات الوفیات، ابن شاکر کتبی، تحقیق احسان عباس، دارصادر، بیروت۔
القرط علی الکامل، ابن سعد الخیر، تحقیق ظہور احمد اظہر، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۸۰ء۔
قشر الفسر، ابوسہل زوزنی، تحقیق عبدالعزیز بن ناصر المانع، مرکز الملک فیصل، ریاض، ۲۰۰۶ء۔
قوت القلوب، ابوطالب مکی، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۰۵ء۔
قیس ولبنی-شعر ودراسۃ، حسین نصار، مکتبۃ مصر، قاہرہ، ۱۹۷۹ء۔
الکامل، المبرد، تحقیق محمد احمد الدالی، موسسۃ الرسالۃ، بیروت۔
کشف المحجوب، سید علی ہجویری، اردو ترجمہ غلام معین الدین نعیمی اشرفی، لاہور، ۱۹۷۰ء۔
الکشکول، بہاء الدین عاملی، داراحیاء الکتب العربیہ، قاہرہ، ۱۹۶۱ء۔
کلیات اقبال فارسی، غلام علی اینڈ سنز، لاہور، اشاعت چہارم، ۱۹۸۱ء۔
الکواکب السائرۃ باعیان المائۃ العاشرۃ، نجم الدین غزی، دارالکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۹۹۷ء۔
مجلۃ المشرق، بیروت۔
مجلۃ المنار، قاہرہ۔

محاضرات الادباء، راغب اصفہانی، دار مکتبۃ الحیاۃ، بیروت۔
المحب والمحبوب والمشموم والمشروب، السری الرفاء، تحقیق مصباح غلاونجی و ماجد الذہبی، مجمع اللغۃ العربیۃ، دمشق، ۱۹۸۶ء۔
مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح، ملا علی قاری، دار الفکر، بیروت، ۲۰۰۲ء۔
معاہد التنصیص، عباسی، تحقیق محمد محی الدین عبد الحمید، عالم الکتب، بیروت۔
من غاب عنہ المطرب، ثعالبی، تحقیق النبوی شعلان، مکتبۃ الخانجی، قاہرہ، ۱۹۸۴ء۔
المنتحل، میکالی یا ثعالبی، تحقیق یحیی جبوری، دار الغرب الاسلامی، بیروت، ۲۰۰۰ء۔
المنصف، ابن وکیع، جلد اول: تحقیق محمد رضوان الدایہ، دار قتیبہ، دمشق، ۱۹۸۲۔ جلد دوم: تحقیق محمد بن عبداللہ العزام، مرکز الملک فیصل، ریاض، ۲۰۰۸ء۔
الموازنۃ بین ابی تمام والبحتری، آمدی، تحقیق السید احمد صقر، دار المعارف، قاہرہ۔
الموشح، مرزبانی، تحقیق علی محمد بجاوی، دار الفکر العربی، قاہرہ۔
نقش آزاد، مرتبہ غلام رسول مہر، کتاب منزل، لاہور، ۱۹۵۸ء۔
نہایۃ الارب، نویری، دار الکتب المصریہ، قاہرہ، ۱۴۲۳ھ۔
الوافی بالوفیات، صفدی، المعہد الالمانی للابحاث الشرقیہ، بیروت، ۲۰۰۸ء۔
الوساطۃ بین المتنبی وخصومہ، ابوالحسن جرجانی، عیسی البابی الحلبی، قاہرہ، وفیات الاعیان، ابن خلکان، تحقیق احسان عباس، دار صادر، بیروت۔
یتیمۃ الدہر، ثعالبی، تحقیق محمد محی الدین عبد الحمید، دار الفکر، بیروت، ۱۹۷۳ء۔

تصوف صوفیہ کے افکار کی روشنی

ڈاکٹر محمد ہمایوں عباس شمس

تصوف کی امہات کتب میں تصوف کے مادہ ہائے اشتقاق سے لے کر فکر و فلسفہ پر مباحث موجود ہیں۔ اکابر نے تصوف میں ناپسندیدہ اعمال وافکار پر سخت تنقید بھی کی ہے۔ تصوف کیا ہے اس سوال کے ابراہیم بن مولد وقی نے ایک سو سے زائد جواب دیے ہیں (۱) ابونصر سراج طوسی (م ۳۷۸ھ) نے تصوف کی تعریف اور ماہیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مختلف اقوال نقل کیے ہیں۔ چند درج ذیل ہیں:

۱- حضرت جنید کے استاد محمد بن علی القصاب سے سوال کیا گیا کہ تصوف کیا ہے: انہوں نے جواب دیا: تصوف ان کریمانہ اخلاق کا نام ہے جو کسی کریم زمانہ میں کسی کریم شخص سے شریف لوگوں کے سامنے ظہور پذیر ہوں۔ (۲)

۲- ابومحمد جدیریؒ سے یہی سوال ہوا تو فرمایا: تصوف نام ہے ہر قسم کے بلند اخلاق کے اندر داخل ہونے کا اور ہر قسم کے کمینے اخلاق سے باہر نکل جانے کا۔ (۳)

۳- عمرو بن عثمان مکیؒ نے اس سوال کا جواب دیا۔ تصوف یہ ہے کہ بندہ ہر لمحہ ایسے عمل میں مشغول ہو جو اس لمحہ کے لیے زیادہ مناسب ہو۔ (۴)

امام قشیری کا کہنا ہے: ''طریقت کی بنیاد آداب شریعت کی حفاظت اور حرام و شبہات کی طرف ہاتھ پھیلانے سے بچنے، حواس کو ممنوع چیزوں سے بچانے اور غفلت ترک کر کے اپنے سانسوں کو اللہ کے ساتھ شمار کرنے پر ہے''۔ (۵)

حضرت شیخ علی ہجویریؒ نے نقل کیا کہ رسم و علم کا نام تصوف نہیں وصف واخلاق کا نام تصوف

چیئر مین شعبہ اسلامیات رعربی، جی سی یونیورسٹی فیصل آباد۔

ہے(۶)۔انہوں نے تصوف کی بنیاد ایک ایسی اصل پر ثابت کی ہے جس سے انکار محال ہے۔یعنی:

ان الصفا صفة الصديق
ان اردت صوفيا على التحقيق(۷)

کہ حق وصداقت کی راہ میں اگر تم صوفی بننا چاہتے ہو تو جان لو صوفی ہونا حضرت صدیق اکبرؓ کی صفت ہے۔اس کی وضاحت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:''صفائے باطن کے لیے کچھ اصول اور فروع ہیں ایک اصل تو یہ ہے کہ دل کو غیر سے خالی کرے اور فرع یہ ہے کہ مکر و فریب سے بھرپور دنیا سے دل کو خالی کردے۔یہ دونوں صفتیں حضرت سیدنا صدیق اکبرؓ کی ہیں۔اس لیے آپ طریقت کے رہنماؤں کے امام ہیں''(۸)۔دوسری صفت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا:''آپؓ کا قلب مبارک دنیائے غدار سے خالی تھا''۔(۹)

حضرت شیخ نے تصوف کی آٹھ بنیادی خصلتوں کا ذکر بھی کیا اور پھر ہر خصلت کو مختلف انبیائے کرام علیہم السلام کے امتیازات وخصائص سے بتایا ہے،حضرت شیخ نے ایک اہم سوال اٹھایا کہ:منکرین تصوف سے یہ پوچھنا چاہیے کہ تصوف کے انکار سے تمہاری کیا مراد ہے؟ یہ سوال آج بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ ان کے دور میں تھا۔اس اصولی نکتہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:''اگر محض اس کے نام سے انکار ہے تو کچھ مضائقہ نہیں اس طرح اس کے معانی وحقائق سے انکار لازم نہیں آتا۔اور اگر اس کے معانی وحقائق سے انکار ہے تو یہ انکار کل شریعت اسلامیہ کا انکار بن جائے گا۔یہی نہیں بلکہ یہ حضور اکرمؐ کے اخلاق حمیدہ اور فضائل جمیلہ اور اسوۂ حسنہ کا بھی انکار کہلائے گا اور اس انکار کے بعد پورا دین ریاکاری بن جائے گا''(۱۰)۔اس قول سے یہ واضح ہوا کہ تصوف کا انکار کرنے والے لوگ دو طرح کے رہے ہیں ایک اس لفظ اور اصطلاح کا انکار کرنے والے تو شیخ علی ہجویریؒ کے نزدیک اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

مگر جو لوگ اس کی حقیقت وروح کا انکار کرتے ہیں وہ دراصل اسلام کے مجموعی فکری ڈھانچے ہی کا انکار کرتے ہیں۔شیخ ابونصر سراج طوسی نے بھی اس حقیقت کی پردہ کشائی کی ہے کہ عہد صحابہؓ اور تابعینؒ میں تو صوفی نام کی ضرورت ہی نہ تھی۔کیونکہ حضورؐ کی صحبت میں رہنے والوں کی ایک خاص عظمت اور خصوصیت ہے جسے یہ حاصل ہوگئی اس پر کوئی اور نام چسپاں کرنا

مناسب ہی نہیں۔ جب ان کو صحبت کی طرف منسوب کیا جو تمام احوال میں سے بزرگ ترین حال ہے تو پھر انہیں کسی اور فضیلت کی وجہ سے فضیلت دینا ناروا ہے کیونکہ صحابیت بزرگ ترین حالت ہے۔(۱۱)

جب یہ بات طے ہوئی کہ نام سے کوئی فرق نہیں پڑتا تو آیئے ان لوگوں کے افکار کا ایک اجمالی جائزہ لیا جائے۔ایک عمومی طرز فکر کو ڈاکٹر پیر محمد حسن نے امام قشیری کے اسلوب کے ذکر میں بایں الفاظ بیان کیا ہے: ''پھر تصوف کے مسائل کو لیا ہے اور ہر مسئلہ کے متعلق قرآنی آیات اور احادیث نبویہ پیش کی ہیں تاکہ پڑھنے والے کو معلوم ہو جائے کہ مسائل تصوف کی بنیاد انہی دو اصولوں یعنی کتاب و سنت پر ہے۔قشیری کا شمار چونکہ حفاظ حدیث میں ہوتا ہے اس لیے انہوں نے تمام احادیث اپنی سند سے پیش کی ہیں۔(۱۲)

اس باب میں حضرت ابوبکر بن ابواسحاق کلاباذی کا نقطہ نظر تمام صوفیہ کی نمائندگی کرتا ہے۔مختلف صوفیہ کا ذکر کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں: ''مذکورہ بالا اشخاص صوفیہ کے سرکردہ اور مشہور لوگ ہیں جن کی فضیلت کی سب نے شہادت دی ہے۔انہوں نے علم القرآن کو جمع کیا جس کی شہادت ان کی کتابوں اور تصانیف سے ملتی ہے۔(۱۳)

یہ اقتباس اس حقیقت کا مظہر ہے کہ جملہ علوم و فنون اسلامیہ پر صوفیہ کی گہری نظر رہی اور اسی کی روشنی میں انہوں نے اپنی فکر کی بنیاد رکھی البتہ اس علم پر صحیح معنوں میں عمل کرنے سے انہیں اکتسابی علم کے علاوہ مزید علوم و فنون بھی ودیعت ہوئے اس فضیلت کے باوجود مسائل دینیہ میں عمل کے اعتبار سے وہ عام مومنین کے ساتھ ہیں حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ نے اس حوالے سے انتہائی اہم نکتہ بیان کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ولایت خاصہ کے مالک اور عام مومن مجتہدین کی تقلید میں برابر ہیں کشف اور الہام سے ان کو کوئی فضیلت نہیں مل سکتی اور وہ تقلید سے باہر نہیں نکل سکتے۔ذوالنون مصری، بایزید بسطامی، جنید بغدادی اور شبلی رحمۃ اللہ علیہم احکام اجتہادیہ میں مجتہدین کی تقلید کرنے میں زید، عمرو بکر اور خالد کے ساتھ جو کہ مومنین سے ہیں برابر ہیں(۱۴)۔ صوفیہ کی تحقیقات میں اختلاف، علماء کے مسائل دینیہ میں اختلاف کی طرح رحمت ہے۔دونوں گروہوں کے اختلاف کی نوعیت میں البتہ فرق ضرور ہے جس کی طرف ابونصر سراج طوسی نے

اشارہ کیا ہے: ''فرق صرف یہ ہے کہ اہل ظاہر کے اختلاف کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دوسروں کے قول کو غلط قرار دیا جائے مگر علم باطن کے اختلاف کا مقصد یہ نہیں ہوتا کیونکہ ان کے استنباطات فضائل، محاسن، احکام، اخلاق، احوال، مقامات اور درجات کے بارے میں ہوتے ہیں'' (۱۵)۔ انہوں نے قرآن و حدیث سے استنباط میں صوفیہ کے طریق کی وضاحت بھی کی ہے (۱۶)۔ عبدالعزیز دباغ کے ہاں بکثرت ایسی مثالیں مل جاتی ہیں جن سے ان کے اصول استنباط کا پتہ چلتا ہے۔

تصوف کی اساسیات کو اجمالی طور پر جاننے کے بعد عقائد و اعمال کے حوالے سے چند مثالوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ عقیدہ توحید کی وضاحت کرتے ہوئے امام قشیری لکھتے ہیں۔

اس جماعت کے جس قدر شیوخ گذرے ہیں انہوں نے تصوف کے قواعد کی بنیاد توحید کے صحیح اصولوں پر رکھی اور انہوں نے اپنے عقائد کو بدعتوں سے محفوظ رکھا ان قواعد کی پیروی کی ہے جن پر انہوں نے سلف صالحین اور اہل سنت کو پایا۔ (۱۷)

شریعت کی پاس داری اور سنت نبویؐ پر عمل کے حوالے سے ان کا نقل فرمودہ واقعہ پیش خدمت ہے۔

بشر حافی نے خواب میں رسول اللہؐ کی زیارت کی آپؐ نے پوچھا: اے بشر کیا تجھے معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں تمہارے ساتھیوں میں اس قدر بلند مرتبہ کیوں کر عطا کیا۔

میں نے عرض کی یا رسول اللہؐ مجھے تو معلوم نہیں، فرمایا: تجھے اس قدر بلند مرتبہ اس لیے دیا گیا کہ تو میری سنت کی پیروی کرتا ہے صالحین کی خدمت کرتا ہے اپنے بھائیوں سے خیر خواہی کرتا ہے اور میرے صحابہ اور اہل بیت سے محبت کرتا ہے یہی وہ امور ہیں جنہوں نے تجھے ابرار کے درجہ تک پہنچا دیا۔ (۱۸)

اطاعت و اتباع نبویؐ پر صوفیہ کے ہاں اس قدر زور ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ صوفی کا ذوق بھی ذوق نبی کے تابع ہو۔ اس حوالے سے حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اتباع نبوی کے ساتھ مراتب کا ذکر کیا جو قابل مطالعہ ہیں:

درجہ اول: عوام اہل اسلام کا ہے یہ تصدیق قلبی کے بعد اطمینان نفس سے قبل جو درجہ ولایت سے مربوط ہے، احکام شرعیہ کی بجا آوری اور سنت سنیہ کی اتباع ہے علمائے ظواہر، عابد اور

زاہد حضرات جن کا معاملہ ابھی تک اطمینان نفس تک نہیں پہنچا سب اس درجہ میں مشترک ہیں۔اس متابعت صوری کے حصول میں سب برابر ہیں۔چونکہ نفس اس مقام میں کفر و انکار سے آزاد نہیں ہوتا تو لازمی طور پر یہ خاص درجہ صرف متابعت کی صورت رکھتا ہے متابعت کی یہ صورت حقیقی متابعت کی مانند آخرت کی فلاح اور خلاصی کا موجب،عذاب نار سے نجات دلانے والی اور دخول جنت کی بشارت سنانے والی ہے۔حق تعالیٰ نے کمال کرم سے انکار نفس کا اعتبار نہ کر کے صرف تصدیق قلبی پر کفایت فرمائی ہے اور نجات کو اس تصدیق کے ساتھ مربوط فرما دیا ہے۔

درجہ دوم: آں سرور علیہ وعلی آلہ الصلوٰۃ والسلام کے ان اقوال و اعمال کی متابعت ہے جو باطن سے تعلق رکھتے ہیں جیسے اخلاق کی تہذیب،صفات رذیلہ کی مدافعت،باطنی امراض اور اندرونی بیماریوں کا ازالہ کرنا ہے۔متابعت کا یہ درجہ مقام طریقت سے متعلق اور ان ارباب سلوک سے مخصوص ہے جو طریقہ صوفیہ کو شیخ مقتدا سے اخذ کر کے سیر الی اللہ کی وادیوں اور بیابانوں کو قطع کرتے ہیں۔

درجہ سوم: آپ سرور علیہ وعلی آلہ الصلوٰۃ والسلام کے احوال،اذواق اور مواجید کی متابعت ہے جو ولایت خاص کے مقام سے تعلق رکھتا ہے۔اور یہ درجہ ارباب ولایت کے ساتھ مخصوص ہے جو مجذوب سالک یا سالک مجذوب ہوں۔

درجہ چہارم: متابعت کا یہ وہ درجہ ہے کہ پہلے درجے میں اس متابعت کی صورت تھی یہاں اس متابعت کی حقیقت ہے متابعت کا یہ درجہ علمائے راسخین شکر اللہ تعالیٰ سعیہم کے ساتھ مخصوص ہے جو اطمینان نفس کے بعد حقیقت متابعت کی دولت سے متحقق ہیں۔اولیاء اللہ قدس اللہ تعالیٰ اسرارھم کو تمکین قلب کے بعد اگرچہ ایک طرح کا اطمینان نفس حاصل ہو جاتا ہے لیکن نفس و کمال درجہ اطمینان کمالات نبوت کے حصول کے بعد حاصل ہوتا ہے یہ کمالات علمائے راسخین کو بطریق وراثت حاصل ہوتے ہیں۔اس مرتبہ میں عارف مقطعات قرآنیہ کے اسرار کے فہم اور کتاب و سنت کے متشابہات کی تاویل سے فائز المرام ہوتا ہے۔یہ خیال نہ کریں کہ یہ **یـد** (ہاتھ) کی تاویل قدرت سے اور **وجـہ** (چہرہ) کی تاویل ذات سے کرنے کے مانند ہے کیونکہ یہ تاویل علم ظاہر سے پیدا ہوتی ہے ان کا اسرار سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ اسرار خاصہ ہیں جو بالاصالت انبیائے کرام علیہم السلام کا حصہ ہیں اور **وراثۃً صدیقین** اور اولیاء کو عطا کیے جاتے ہیں۔اس دولت عظمیٰ تک

پہنچنا دوسرے راستوں کی نسبت ولایت کی راہ سے زیادہ آسان اور اقرب ہے اور وہ سنت سنیہ کا التزام اور بدعت نامرضیہ کے اسم و رسم سے اجتناب ہے۔ آج یہ بات مشکل معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ سارا جہاں دریائے بدعت میں غرق اور سنت نبوی علی صاحبہا الصلوات سے دور ہے۔

درجہ پنجم: آں سرور علیہ وعلی آلہ الصلوٰۃ والسلام کے صرف ان کمالات کا اتباع ہے جن کے حصول میں علم و عمل کا کوئی دخل نہیں بلکہ ان کمالات کا حصول محض فضل ربانی اور احسان رحمانی پر موقوف ہے۔ یہ درجہ اس قدر بلند ہے کہ سابقہ درجات کو اس درجہ سے ادنی نسبت بھی نہیں۔ یہ کمالات بالاصالت اولوالعزم انبیائے عظام علیہم السلام کے ساتھ مخصوص ہیں ان کے طفیل بعض اولیائے کرام کو ان کمالات سے مشرف فرما دیتے ہیں۔

درجہ ششم: آں سرور علیہ وعلی آلہ الصلوٰۃ والسلام کے ان کمالات کا اتباع ہے جو آں سرور علیہ وعلی آلہ الصلوٰۃ والسلام کے مقام محبوبیت کے ساتھ مخصوص ہیں جس طرح درجہ پنجم میں کمالات کا فیضان محض فضل و احسان پر تھا اسی طرح درجہ ششم میں ان کمالات کا فیضان محض محبت پر موقوف ہے جو تفضّل و احسان سے فوق (اوپر) ہے۔ یہ درجہ اگرچہ بالاصالت حضور اکرمؐ کے ساتھ مخصوص ہے لیکن حضور اکرمؐ کی تبعیت میں اولیائے صدیقین میں سے اقل قلیل کو نصیب ہوتا ہے۔

پہلے درجہ کے علاوہ متابعت کے یہ پانچ درجات مقامات عروج کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اور ان کا حصول بھی صعود (عروج) سے ہی مربوط ہے۔

درجہ ہفتم: متابعت کا یہ درجہ ہبوط و نزول سے متعلق ہے اور یہ درجہ سابقہ درجات کا جامع ہے کیونکہ اس مقام نزول میں تصدیق قلبی بھی ہے اور تمکین قلبی بھی، نفس کا اطمینان بھی اور اجزائے قلب کا اعتدال بھی ہے جو طغیان و سرکشی سے باز آ گئے ہیں سابقہ درجات گویا اس درجہ متابعت کے اجزا تھے اور یہ درجہ ان اجزا کے کل کی مانند ہے اس درجہ میں پہنچ کر تابع متبوع کے اس قدر مشابہ ہو جاتا ہے کہ دور سے دیکھنے والا خیال کرتا ہے کہ یہ دونوں (تابع و متبوع) متحد ہو گئے ہیں اور ان دونوں کے درمیان امتیاز ختم ہو گیا ہے۔ کامل متبع وہ شخص ہے جو ان سات درجات سے آراستہ ہو۔ (۱۹)

بعض صوفیہ نے حالت سکر میں کچھ ایسے کلمات کہے جن سے اللہ تعالیٰ اور رسولؐ کی

اطاعت میں فرق محسوس ہوتا تھا۔ ان پر نقد کرتے ہوئے حضرت مجددؒ نے لکھا:

ہاں بعض مشائخ کبار قدس اللہ تعالیٰ اسرارھم نے سکر اور غلبہ حال کی وجہ سے ایسی باتیں کہی ہیں جو ان دو اطاعتوں کے درمیان تفرقہ ظاہر کرتی ہیں اور ایک کی محبت کو دوسرے کی محبت پر ترجیح دینے کی خبر دیتی ہیں۔ جیسا کہ منقول ہے کہ سلطان محمود غزنوی اپنی بادشاہت کے دوران ''خرقان'' کے نزدیک ٹھہرا ہوا تھا، وہاں سے اس نے اپنے وکیل کو حضرت شیخ ابوالحسن خرقانیؒ کی خدمت میں بھیجا اور خواہش ظاہر کی کہ حضرت شیخ اس (سلطان) کی ملاقات کو آئیں اور اپنے وکیل سے کہہ دیا کہ اگر شیخ سے اس معاملہ میں توقف محسوس ہو تو یہ آیت: اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُوْلِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ (اطاعت کرو اللہ تعالیٰ کی اور اطاعت کرو رسول اللہؐ کی اور ان کی جو تم میں سے حکمراں ہوں) ان کے سامنے پڑھیں۔ (چنانچہ) جب وکیل نے شیخ کی طرف سے توقف محسوس کیا تو آیت کریمہ ان کے سامنے پڑھی۔ شیخ نے جواب میں فرمایا کہ میں ''اَطِیْعُوا اللّٰہَ'' میں اس قدر گرفتار ہوں کہ ''اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' کی اطاعت سے شرمندہ ہوں اور اطاعت اولی الامر کے متعلق کیا بیان کروں...... حضرت شیخ نے اطاعت حق سبحانہ وتعالیٰ کو اطاعت رسول کے علاوہ سمجھا، یہ بات (سکر کی بنا پر ہے اور استقامت سے بعید ہے، مستقیم الاحوال مشائخ نے اس قسم کی باتوں سے پرہیز کیا ہے...... اور شریعت و طریقت اور حقیقت کے تمام مراتب میں حق سبحانہ وتعالیٰ کی اطاعت کو رسولؐ کی اطاعت میں جانتے ہیں اور حق تعالیٰ کی وہ اطاعت جو آنحضرتؐ کی صورت میں نہ ہو اسے عین ضلالت و گمراہی خیال کرتے ہیں۔

اسی طرح یہ حکایت بھی منقول ہے کہ شیخ مہنہ شیخ ابوسعید ابوالخیر کے ہاں مجلس منعقد تھی اور سادات خراساں کے ایک سید بزرگ بھی اس مجلس میں بیٹھے تھے۔ اتفاقاً ایک مجذوب مغلوب الحال اس مجلس میں آیا اور حضرت شیخ نے سید بزرگ پر اس مجذوب کو (بطور تعظیم) فوقیت دی۔ سید صاحب کو یہ بات ناگوار گذری تو حضرت شیخ نے سید صاحب سے فرمایا کہ آپ کی تعظیم تو رسول اللہؐ کی محبت کی وجہ سے ہے اور اس مجذوب کی تعظیم حق سبحانہ وتعالیٰ کی محبت کی بنا پر ہے۔ اس قسم کے اختلاف کو مستقیم الاحوال اکابر جائز نہیں رکھتے اور حق سبحانہ وتعالیٰ کی محبت کے اس کے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت پر غلبہ کو سکر حال پر محمول کرتے ہیں اور بیکار بات سمجھتے ہیں۔ لیکن اتنا ضرور

ہے کہ مقام کمال میں جو مرتبہ ولایت سے ہے، حق سبحانہ وتعالیٰ کی محبت غالب ہوتی ہے اور مقام تکمیل میں جو نبوت کے مقام کا ایک حصہ ہے، محبت رسول غالب ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اطاعت رسولؐ پر ثابت قدم رکھے کیونکہ ان کی اطاعت ہی عین اطاعت حق ہے۔(۲۰)

شیخ فرید کو ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

''لہٰذا آپ پر اوامر ونواہی میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پوری پوری اتباع اور اطاعت لازم وواجب ہے اور کمال متابعت آں سرور علیہ وعلی آلہ الصلوٰۃ والسلام کی کمال محبت کی فرع ہے''۔(۲۱)

شریعت اسلامیہ میں حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کو بھی اہم گردانا گیا ہے۔ صوفیہ کے ہاں اس حوالہ سے جو عملی رہنمائی ملتی ہے وہ انسانی حقوق کے اس نام نہاد دور کے رویوں سے کہیں بلندتر اور اعلیٰ ترین ہے۔ صوفیہ کے ہاں انسان کی عزت اور انسان کی مدد صرف انسانیت کے ناتے سے ہے ان کے کوئی خفیہ یا پس پردہ دیگر مقاصد نہیں ہوتے۔ موجودہ دور تو صرف نام نہاد احسان کا ذکر کرتا ہے مگر صوفیہ ایثار کی اعلیٰ اور روشن مثالیں پیش کرتے ہیں۔ حضرت خواجہ نظام الدین کی خانقاہ کا نقشہ پروفیسر نثار احمد فاروقی نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے: ''حضرت کی خانقاہ سلاطین وامراء، علماء وفقہاء، عوام وخواص، نوکر پیشہ اور اہل حرفہ وفقراء ومساکین سب کے لیے ایک مرکز کشش بن گئی تھی۔ یہاں قلب وروح کا تزکیہ وتجلیہ بھی ہوتا تھا، سیرت واخلاق کی اصلاح بھی کی جاتی تھی، احکام شریعت کی پاسداری کا درس بھی دیا جاتا تھا، دکھ درد کے مارے ہوئے انسانوں کو تسکین اور تسلی بھی ملتی تھی، فقراء ومساکین کے لیے کھانا کپڑا بھی فراہم ہوتا تھا دعا اور ہمت درویشاں کے طالبوں کو تعویذ بھی دیا جاتا تھا۔ ہر آنے والے کے لیے ایک عام لنگر کھلا ہوتا تھا، قدم قدم پر دستگیری ورہنمائی بھی ہو رہی تھی''۔(۲۲)

حقوق العباد کے ایک خصوصی پہلو کا تذکرہ بھی یہاں ضروری ہے۔ عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ صوفیہ انسان کو بے کار وکاہل بنا دیتے ہیں اور انسان معاشرہ میں کچھ نہ کرنے کا خوگر بن جاتا ہے جس سے وہ حقوق العباد کی جمیع اقسام ادا کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ حالانکہ صوفیہ تو یہ سمجھتے ہیں کہ زمین کو آباد کرنا، اس میں کاشت کرنا ثواب کا کام ہے۔ علاؤ الدولۃ فرماتے ہیں کہ اگر

لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ زمین کو بے کار چھوڑنے میں کس قدر گناہ ہے تو وہ کبھی بھی ایسا نہ کرتے۔ پھر فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص ایسی زمین رکھتا ہے کہ اس سے ۱۰۰۰ من اناج ہوتا ہے لیکن سستی اور کوتاہی سے ۹۰۰ من حاصل کرتا ہے۔ چونکہ ۱۰۰ من اناج اس کی سستی کی وجہ سے انسانوں کے حلق تک نہ پہنچ سکا اس وجہ سے قیامت کے دن اس سے باز پرس ہوگی۔ اگر وہ اس رویے کو زہد اور ترک دنیا کا نام دیتا ہے تو یہ شیطان کی چال ہے اور کوئی شخص اس نکما سے کم درجہ کا قیامت کے دن نہ ہوگا۔ (۲۳)

درج بالا چند اقتباسات سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ان چار چیزوں کو ہم اس بحث کی روشنی میں تصوف کے ارکان کہہ سکتے ہیں۔

۱-محبت الٰہی۔ ۲-اتباع نبوی۔ ۳-اخلاق حسنہ۔ ۴-خدمت خلق۔

ان چاروں کے بارہ میں صوفیہ نے اپنی کتب میں تفصیل سے لکھا اور عمل سے ان کو کر کے دکھایا۔ کیا اصحاب خانہ کی ان گواہیوں کے بعد بھی تصوف کوئی خارج سے آنے والے افکار کا ہجوم کہلائے گا۔

تصوف نے خود اگر ایسے عناصر دیکھے جو شریعت کی روح سے متصادم تھے تو ان پر تنقید کی۔ گویا جو چیز شریعت میں نا قابل قبول ہے اس کو صوفیہ نے کسی بھی صورت میں قبول نہ کیا بلکہ ایسے عناصر کی خود نشاندہی کر دی حضرت شیخ علی ہجویریؒ کے یہ الفاظ قابل مطالعہ ہیں: ''جب زمانہ کے دنیا دار لوگوں نے دیکھا کہ نقلی صوفی پاؤں پر تھرکتے، گانا سنتے اور بادشاہوں کے دربار میں جا کر ان سے مال و منال کے حصول میں حرص و لالچ کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ درباری دیکھتے ہیں تو وہ ان سے نفرت کرتے اور تمام صوفیوں کو ایسا ہی سمجھ کر سب کو برا بھلا کہنے لگتے ہیں کہ ان کے یہی طور طریق ہوتے ہیں اور پچھلے صوفیوں کا بھی ایسا ہی حال تھا حالانکہ وہ حضرات ایسی لغو باتوں سے پاک وصاف تھے وہ اس پر غور و فکر نہیں کرتے یہ زمانہ دین میں سستی و غفلت کا ہے۔

بلاشبہہ جب بادشاہ و حکام پر حرص کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ اسے ظلم و ستم پر آمادہ کر دیتا ہے۔ اور اہل زمانہ طمع و نافرمانی اور گناہ و فسق میں مبتلا ہو جاتے ہیں ریا کاری زاہد کو نفاق میں جھونک دیتی ہے اور ہوائے نفسانی صوفی کو ناچنے پر مجبور کرتی ہے اور گانے سننے پر ابھارتی ہے خبردار

ہوشیار طریقت کے جھوٹے مدعی ہی تباہ ہوتے ہیں نہ کہ اصل طریقت، خوب یاد رکھو اگر مسخروں کی جماعت اپنے مسخرہ پن کو بزرگوں کی ریاضت ومجاہدہ کے اندر ہزار بار پوشیدہ رکھے تو بزرگوں کی ریاضت ومجاہدہ مسخرہ پن نہیں بن سکتی''۔(۲۴)

سید عبدالعزیز دباغ نے صوفیہ کی سوانح نگاری میں غلط رجحانات پر بھی تنقید کی ہے اور وضاحت کی کہ صرف کرامات کے تذکروں نے بہت سی غلط فہمیوں کو جنم دیا ہے جن سے بعض اعتقادی نوعیت کی ہیں۔(۲۵)

حوالہ جات

(۱) طوسی، ابونصر سراج، کتاب اللمع فی التصوف، مترجم: ڈاکٹر پیر محمد حسن، ادارہ تحقیقات اسلامی، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۶۲۔ (۲) ایضاً، ص ۵۹۔ (۳) ایضاً۔ (۴) ایضاً۔ (۵) قشیری، امام ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن، مترجم: ڈاکٹر پیر محمد حسن، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ۱۳۹۰ھ/۱۹۷۰ء۔ (۶) ہجویری، سید علی بن عثمان، کشف المحجوب، تحقیق: دکتر محمود عبدی، سروش تہران ۱۳۸۲، ص ۵۲۔ (۷) ایضاً، ص ۴۴۔ (۸) ایضاً۔ (۹) ایضاً، ص ۴۵۔ (۱۰) ایضاً، ص ۶۰۔ (۱۱) کتاب اللمع فی التصوف، ص ۵۶۔ (۱۲) رسالہ قشیریہ، ص ۴۸۔ (۱۳) التعرف، ص ۴۸۔ (۱۴) مکتوبات امام ربانی، دفتر دوم، مکتوب ۵۵۔ (۱۵) کتاب اللمع فی التصوف، ص ۱۷۱۔ (۱۶) ایضاً، ص ۱۶۵ ومابعد۔ (۱۷) کلاباذی ابوبکر بن ابواسحاق، تعرف، مترجم: ڈاکٹر پیر محمد حسن، تصوف فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۴۱۹ھ/۱۸۸۹ء، ص ۱۰۷۔ (۱۸) ایضاً، ص ۱۳۲۔ (۱۹) مکتوبات امام ربانی، دفتر دوم، مکتوب ۱۵۴، مکتوبات سعیدیہ، مکتوب ۱۵۔ (۲۰) ایضاً، دفتر اول، مکتوب ۱۵۲۔ (۲۱) ایضاً، مکتوب ۱۶۵۔ (۲۲) فاروقی، پروفیسر نثار احمد، مقدمہ فوائد الفواد، مترجم: خواجہ حسن نظامی، زاویہ لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۳۷۔ (۲۳) جامی، مولانا عبدالرحمٰن، نفحات الانس، مترجم: شمس بریلوی، پروگریسو بکس، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۶۳۲۔ (۲۴) کشف المحجوب، ص ۵۸-۵۹۔ (۲۵) سلجماسی، احمد بن مبارک، خزینۂ معارف اردو ترجمہ ابریز، مترجم: ڈاکٹر پیر محمد حسن، احمد بک کارپوریشن، راول پنڈی، ۲۰۰۹ء، ص ۴۳۴۔

بارہویں و تیرہویں صدی ہجری کے چند اہم ہندوستانی قلمی سفرنامے

ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن

فارسی زبان دنیا کی ایک زندہ اور ترقی یافتہ زبان ہے۔ ایرانی قوم نہایت بیدار اور ترقی پذیر قوم ہے۔ اس قوم نے سفرنامہ نگاری میں اہم رول ادا کیا ہے اور نہایت گراں قدر کتابیں اس موضوع پر لکھی ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے فارسی ادبیات کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہاں کے فارسی دانوں نے بھی اس فن کی آبیاری کرنے اور اس کو بام عروج تک پہنچانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے اور نہایت شاندار تاریخ رقم کی ہے۔

مطالعۂ کتب سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کا عام رجحان اسلامی ممالک اور خاص طور پر ارض حجاز کی طرف رہا ہے۔ اسلامی اخوت کے رشتوں میں بندھے ہونے کی وجہ سے ان ممالک کا سفر اور وہاں کے حالات و واقعات سے دوسروں کو باخبر کرنے کا خیال تاریخی و جغرافیائی مقاصد کے علاوہ دینی و روحانی جذبات کے تحت رہا ہے۔ خاص طور پر ارض حجاز پر نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت عیاں ہو کر سامنے آتی ہے کہ یہ ملک پوری دنیا کے مسلمانوں کے لیے دل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کے بغیر کوئی مسلمان زندہ نہیں رہ سکتا۔ وہ مسلمانوں کا مرکز دین و ایمان ہے۔ جہاں قرآن مجید کا نزول ہوا۔ خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وہیں بعثت ہوئی۔ ایسے میں سرزمین حجاز کا قصد، مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ کی بار بار حاضری، وہاں کے ذرہ ذرہ سے پیار، یہ سب اس مقدس سرزمین سے غیر معمولی عقیدت و محبت کا نتیجہ ہے۔ جو صرف اسلام کی دین ہے۔ اسی بنا پر دنیا کے مسلمانوں نے عام طور پر اور ہندوستانی مسلمانوں نے خاص پر سب سے زیادہ

صدر رابطہ ادب اسلامی، بہار شاخ، پٹنہ۔

اسفار اسی مقدس سرزمین کے کیے ہیں اور وہاں کے حالات وواقعات سے دنیا کو باخبر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے سفرنامے سب سے زیادہ اسی سرزمین کے ہیں جو تاریخی و جغرافیائی معلومات کے علاوہ دینی معلومات ومسائل پر مشتمل ہوتے ہیں۔ یہ معلومات ومسائل خشک نہیں ہوتے بلکہ جذبوں کی زبان میں روحانی لذت سے ہمکنار کرتے ہیں۔

یہ سفرنامے دوطرح کے ہیں۔ مطبوعہ ومخطوطہ، مطبوعہ سفرنامے تو کہیں نہ کہیں دستیاب ہیں لیکن قدیم قلمی سفرنامے گویا نایاب ہیں اوران کا حصول بہت مشکل ہے اوران کی اہمیت یوں بھی زیادہ ہے کہ ان سے قدیم زمانے کے حالات وواقعات سے آگاہی ہوتی ہے اورتاریخ وتحقیق کی نئی راہیں بھی سامنے لانے میں یہ مددگار ہوتے ہیں، ایسے ہی اہم، نادراور مشکل الحصول سفرناموں میں بیان واقع، زبدۃ الاخبار فی سوانح الاسفار اور حالات الحرمین ہیں۔ یہ تینوں سفرنامے فارسی زبان میں ہیں اور یہ خدابخش لائبریری پٹنہ کے خزانہ علمی کا بیش بہا حصہ ہیں۔ ذیل میں ان کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے:

۱- بیان واقع: یہ بارہویں صدی ہجری کا ایک اہم سفرنامہ ہے جس کو نادرشاہ کے دربار کے ایک اہم ملازم عبدالکریم بن خواجہ عاقبت محمود بن خواجہ محمد بلاقی نے لکھا ہے۔ جس میں اس کا سفرحج اور نادرشاہ کی ہندوستان میں آمد اور مراجعت اور محمد شاہ بادشاہ کے تاریخی واقعات قلم بند کیے گئے ہیں۔

یہ قلمی نسخہ دراصل کتب خانہ دیوان ناصرعلی کھجوا بہار کے ایک قدیم نسخے کی نقل ہے۔ یہ نقل یحییٰ اسلام پوری نے خدابخش لائبریری کی فرمائش پر ۱۳۷۹ھ/۱۹۶۰ء میں کی ہے۔ یہ نسخہ ۱۳۴/اوراق پر مشتمل ہے۔ اصل نسخے میں جابجا عبارتیں غائب تھیں اور بعض جملے ناقابل قرأت تھے۔ ناقل نے ایسی عبارتوں کو اسی طرح چھوڑ دیا جس کی وجہ سے قاری اس نسخے سے پوری طرح استفادہ نہیں کرسکتا۔ تاہم جو عبارتیں واضح اور قابل قرأت ہیں ان کی روشنی میں مصنف کے سفرحج کی روداد اور تاریخی واقعات درج ذیل سطور میں پیش کیے جاتے ہیں۔

مصنف کے مطابق جس زمانے میں نادرشاہ ہندوستان آیا، اس وقت وہ شاہ جہاں آباد میں مقیم تھے۔ حج بیت اللہ کی ان کی دیرینہ خواہش تھی۔ حسن اتفاق سے اسی زمانے میں میرزا اکبرعلی

خراسانی سے ان کی ملاقات ہوگئی جو ان دنوں نادرشاہ کے دربار میں ایک اہم منصب پر فائز تھے۔ انہوں نے دربار شاہی میں مصنف کو ملازمت دلا دی اور حج بیت اللہ کے لیے رخصت بھی منظور کرادی۔ مصنف سفر حج کے لیے روانہ ہوئے اور حج کی برکت سے یہ کتاب تیار ہوگئی جس میں نادرشاہ کی ہندوستان میں آمد، واپسی اور پھر خراسان، مازندران اور قزوین تک کے حالات اس لیے آگئے کہ مصنف نادرشاہ کے ساتھ تھے۔ پھر قزوین سے یہ ساتھ چھوٹ گیا اور مصنف حج کی غرض سے اس سے آگے بڑھ گئے، وہ لکھتے ہیں۔

۲۴/ ربیع الاول ۱۱۵۴ھ کو وہ قزوین پہنچے۔ ربیع الثانی میں ہمدان گئے، پھر کرمان کے راستے سے بغداد پہنچے جہاں انہوں نے امام کاظم علیہ السلام اور دیگر اکابر کے مقامات کی زیارت کی۔

ورق ۱۸۳ الف سے ان کے مکہ معظّمہ کے سفر کا آغاز ہوتا ہے جس کو انہوں نے ''فصل درذکر متوجہ شدن محرر بجانب مکہ بہ ہمراہ قافلہ از راہ شام وحلب'' کے ذیل میں بیان کیا ہے۔

شام وحلب کے محفوظ راستے: بغداد سے وہ شام وحلب کے راستے مکہ معظّمہ کے لیے روانہ ہوئے۔ کیونکہ نہر زبیدہ کے راستے گرچہ قریب تھے۔ لیکن پرخطر اور غیر محفوظ تھے۔ اس کے علاوہ اس وقت کے حاکم بغداد احمد شاہ کے ساتھ دوسرے بادشاہوں کی دشمنی اور عربوں کی آپسی لڑائی کی وجہ سے یہ راستے بہت بھیانک اور خطرناک ہوگئے تھے۔ اس لیے ناظم بغداد نے حجاج کرام کو ان راستوں سے جانے سے روک دیا۔ مجبوراً وہ لوگ شام وحلب کے راستے سے مکہ معظّمہ کے لیے روانہ ہوئے۔ جس سے گرچہ دوری کافی بڑھ گئی لیکن امن وحفاظت کی ضمانت بھی ہوگئی۔

مسافت: بقول مصنف اس زمانے میں اہل روم انگریزی گھڑی استعمال کرتے تھے اور سفر وحضر میں اپنی جیب میں رکھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس سفر کی مسافت کو متوسط درجے کے اونٹ کی چال سے فی گھنٹے (ساعت) کی رفتار سے شمار کرتے ہوئے بیان کردیا ہے۔ بلدہ موصل کے لیے چہار ساعت، بلدہ حلب کے لیے شش ساعت، قصبہ حمص کے لیے دہ ساعت کی دوری بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ اس لحاظ سے بغداد سے مکہ تک کی مسافت طے کرنے کے لیے ۱۸۷ گھنٹے لگتے تھے۔

حلب–ایک خوبصورت شہر: بغداد سے حج کا یہ قافلہ پہلے حلب پہنچا۔ وہاں مصنف نے

حضرت یحییٰ علیہ السلام کے مزار پر حاضری دی جو وہاں کی جامع مسجد کے قریب تھا۔ انہوں نے حلب کی تعریف میں کہا کہ وہاں کی دکانیں، بازار، سڑکیں بہت خوبصورت اور سجی ہوئی تھیں۔ وہاں کے دکاندار خوبصورت لباس پہن کر دکانوں پر بیٹھتے۔ مصنف کو حلب سے زیادہ بارونق، پاکیزہ اور دلکش کوئی دوسرا شہر نظر نہیں آیا (ق ۸۸ ب)۔ وہاں سے حج کے لیے روانگی کا طریقہ یہ لکھا کہ اطراف و جوانب کے حجاج کرام حلب میں ایک خاص جگہ جمع ہو جاتے اور بڑے بڑے قافلوں کی صورت میں اونٹوں پر سوار ہو کر شام کے لیے روانہ ہوتے تھے۔ مصنف کا قافلہ بھی شام کے لیے روانہ ہوا اور دمشق میں قیام پذیر ہوا۔

شام-خوبصورت شہر اور سفر حج کا مرکز: اب دمشق سے مدینہ منورہ کے سفر کا ذکر ''فصل در ذکر توجہ نمودن بسوی مدینہ منورہ از راہ بیابان'' کے تحت کیا گیا ہے۔ انہوں نے لکھا کہ زمانہ قدیم سے یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ ایران، توران، روم اور شام کے علاقوں کے حجاج کرام شوال کے مہینے میں یہاں آ کر جمع ہوتے۔ حاکم دمشق میر حجاج متعین ہوتے اور انہیں کی رہنمائی اور دیکھ بھال میں ان تمام ممالک کے حجاج بڑے قافلوں کی شکل میں اونٹوں پر سوار ہو کر مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہوتے تھے۔ اس دور میں یہ راستے نہایت خطرناک ہوتے تھے۔ لیکن میر حجاج، فوج کی موجودگی اور اچھے نظم و نسق کی وجہ سے رہزنی کے واقعات بہت کم ہوتے تھے۔ میر حجاج کی موجودگی سے دوسرا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ قافلوں کے درمیان اچھا نظم و نسق قائم رہتا۔ کس شتربان کو آگے یا پیچھے چلنا ہے۔ کس رفتار سے چلنا ہے، کہاں کہاں قیام کرنا ہے، کس کو کس منزل پر ٹھہرنا ہے، کھانے پینے کا انتظام کہاں کہاں ہے۔ یہ تمام امور میر حجاج کی موجودگی میں اور اس کی ہدایت پر طے ہوتے تھے۔ اس لیے سفر حج بڑے اطمینان و سکون سے طے ہو جاتا۔ نماز ادا کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ ہر نماز کے وقت میر حجاج کسی مناسب جگہ قیام کرتے اور ضروریات سے فارغ ہو کر نماز باجماعت ادا کر کے آگے روانہ ہو جاتے تھے۔ رات کے وقت میر حجاج آتش ہوائی روشن کرتے جس کو دیکھ کر تمام حجاج رک جاتے اور کھانے اور نماز سے فارغ ہوتے تھے۔ یہ عمل ''عوافی'' کہلاتا۔ حاجیوں کی یہ خدمت بہت اہم سمجھی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے جو میر حجاج سات سال تک یہ خدمت انجام دے دیتا اس کو دربار شاہی میں وزارت کا رتبہ و عہدہ حاصل ہو جاتا۔

راستے میں شتربان اشعار پڑھتے اور حجاج کے حوصلے بڑھاتے ۔ مصنف ان تمام مراحل سے گزرتے ہوئے مدینہ منورہ پہنچ گئے ۔ جہاں انہوں نے روضۂ اقدسؐ پر حاضری دی اور سلام ودرود پیش کیا اور مقدس مقامات کی زیارت بھی کی ۔ ۶/ذی الحجہ کو وہ مکہ معظّمہ کے لیے روانہ ہو گئے ۔ انہوں نے محسوس کیا کہ مسجد حرام، مولد النبیؐ اور مسجد جن وغیرہ مکہ کے دکانوں، بازاروں اور گھروں کے مقابلے میں نشیب میں ہیں ۔

ایک دلچسپ بات یہ بھی لکھی ہے کہ مکہ معظّمہ میں وہاں کی خواتین تازہ (کچے) سیب زیادہ پیسے دے کر خریدتی تھیں اور اس کو وجہ افتخار سمجھتی تھیں ۔ اس وقت کے حاکم مکہ نہایت عادل، انصاف پسند اور فرض شناس تھے ۔ وہ حاجیوں کے آرام وراحت کا پورا خیال رکھتے تھے ۔ اور شرپسندوں اور رہزنوں کے خلاف سخت تادیبی کارروائی کرتے تھے ۔ تمام حجاج کرام ان سے بہت خوش تھے ۔ مصنف نے تین ماہ مکہ معظّمہ میں قیام کیا ۔ اس کے بعد ربیع الاول ۱۱۵۵ھ میں وہاں سے جدہ کے لیے روانہ ہو گئے ۔ (ق ۹۶ ۔ الف)

جدہ کے تاریخی واقعات: مصنف کی نظر میں جدہ بڑا خوبصورت شہر ہے ۔ جہاں عیسائی خاصی تعداد میں رہتے ہیں ۔ لیکن حدود حرم میں داخل نہیں ہو سکتے ۔ سمندر کے کنارے حضرت حوّا کا مزار ہے، یہ شہر سے باہر ہے اور دیگر مزاروں کی طرح بلند ومرتفع نہیں ہے ۔ انہوں نے اس کی زیارت کی اور لکھا کہ حضرت حوّا کی قبر کی لمبائی جیسا کہ میں نے اپنے قدم سے پیائش کی ہے ۱۹۷ قدم تھی ۔ (ق ۹۶ ۔ ب)

یہاں کا دستور ہے کہ جدہ بندرگاہ کا حاکم قیصر روم کی طرف سے بحال ہوتا ہے ۔ اسی طرح مکہ معظّمہ کا حاکم بھی وہیں سے بحال ہوتا ہے لیکن مکہ کا حاکم شرفائے مکہ سے ہوتا ہے جو امام حسن کی اولاد سے ہیں ۔ (ص ۹۶ ب)

یمن کے واقعات: جدہ میں ایک ماہ قیام کر کے مصنف فرنگی جہاز پر سوار ہو کر بنگال کی بندرگاہ ہگلی کے لیے روانہ ہوئے ۔ درمیان میں یمن کی بندرگاہ ''موکھا'' (Mokha) میں پندرہ روز قیام کیا ۔ یمن کا پایہ تخت صنعاء ہے ۔ بیشتر باشندے زیدی فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں اس فرقہ کے لوگ نماز کے وقت پائجامے کی جگہ لنگی پہن کر نماز پڑھتے ہیں (ق ۹۷ الف) ۔ یہاں

حضرت عمر شاذلیؒ کا مزار ہے، ان کی تدفین سے قبل یہاں کا پانی نمکین تھا لیکن تدفین کے بعد یہ میٹھا اور لذیذ ہو گیا۔ بازار میں انگور، آم، شفتالو خوب ملتے ہیں۔(ق ۱۹۷الف)

۲- زبدۃ الاخبار فی سوانح الاسفار: یہ حاجی علی مرزا کی تصنیف ہے جو تیرہویں صدی ہجری کے دانشور اور شاعر ہیں۔ ان کے والد کا نام مرزا ابوطالب تھا جو دہلی کے باشندہ تھے۔ بعد میں حاجی علی مرزا صوبہ عظیم آباد منتقل ہو گئے اور مستقل طور پر وہیں سکونت اختیار کر لی۔ مفتون تخلص تھا۔ فارسی زبان کے اچھے شاعر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ زبدۃ الاخبار میں جا بجا ان کے فارسی اشعار ملتے ہیں جو خوبصورت اور برمحل ہیں۔ انہوں نے اس کتاب کو اس دور کے حاکم مرزا امین الدولہ ناصر جنگ کے نام منسوب کیا ہے اور کتاب کے مقدمہ میں ایک نظم کہہ کر خراج عقیدت پیش کیا ہے۔(دیکھیے ق ۳/الف)

یہ قلمی نسخہ دو جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد ۱۲۴/اوراق پر مشتمل ہے جبکہ دوسری جلد ۱۷۸/اوراق میں ہے۔ اس نسخے کی کتابت مصنف کی ہدایت پر ان کے بھائی مرزا امیر علی نے رجب المرجب ۱۲۴۶ھ میں کی ہے۔ ترقیمہ میں یہ عبارت اس طرح ہے:

"الحمد للہ رب العالمین کہ محیط اول کتاب زبدۃ الاخبار فی سوانح الاسفار بعرصہ یک شہر در شہر عظیم آباد بتاریخ بست و پنجم شہر رجب المرجب سنہ ۱۲۴۶ھ از خط خام مرزا امیر علی متوطن شاہ جہاں آباد باشندۂ حال عظیم آباد بحسب الارشاد جناب بھائی صاحب قبلہ و کعبہ ام جناب حاجی علی مرزا صاحب کہ مصنفش ذات ممدوح است صفت اختتام پذیرفت"۔

مصنف نے کتاب کو دو بڑے ابواب محیط اول اور محیط ثانی میں تقسیم کیا، پھر انہار کے نام سے تقسیم در تقسیم میں سفر کے حالات و واقعات تحریر کیے گئے ہیں۔ عرب ممالک کے حالات پہلی جلد اور دوسری جلد کے نہر دوم میں بیان کیے گئے ہیں۔ جس میں جدہ، مکہ معظّمہ، مدینہ منورہ، مسقط کے حالات شامل ہیں جلد دوم کے نہر سوم تا نہر ہفتم میں ایران کے حالات و واقعات میں شہر مشہد، سمنان، دامغان اور نیشاپور کا ذکر ہے۔ اس ایران والے حصہ کو ڈاکٹر ذاکرہ شریف قاسمی نے "زبدۃ الاخبار فی سوانح الاسفار" (سفرنامہ ایران قرن نوزدہم میلادی) کے عنوان سے مدون کر کے دہلی سے ۲۰۰۳ء میں شائع کیا ہے۔ افسوس ہے کہ عرب والے حصہ کی طرف توجہ نہیں کی گئی، یہ حصہ نہایت اہم ہے اور تدوین و تحقیق کا محتاج ہے۔ کیونکہ مصنف نے ارض عرب اور خاص طور پر

مکہ معظّمہ، مدینہ منورہ اور دیگر مقدس مقامات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، بعض مشتملات یہ ہیں:

پہلی جلد نہر اول سے شروع ہوتی ہے، مصنف نے لکھا کہ انہوں نے ۸/ربیع الثانی ۱۲۴۱ھ/۱۸۲۵ء کو عظیم آباد سے دریائی سفر شروع کیا (ق ۵/الف)۔ باڑھ، بھاگلپور، راج محل اور ہگلی ہوتے ہوئے کلکتہ پہنچے۔ نہر دوم میں قیام کلکتہ کا بیان ہے۔ نہر سوم میں کلکتہ سے روانگی اور اس وقت کی دشواریوں کو بیان کیا گیا ہے۔ نہر چہارم میں کلکتہ کی بندرگاہ کا ذکر ہے۔ نہر پنجم میں موکھا (Mokha) کے حالات ہیں۔ نہر ششم میں جدہ کے ذکر میں وہاں کے قیام کو بیان کیا ہے، وہاں کی آبادی، مکانات، ماحول، دکان، بازار، قہوہ خانوں اور اہل حرفہ کا تفصیل سے ذکر کیا ہے (ق ۳۹/الف)۔ نہر ہفتم میں مدینہ کے قیام اور اس کی تفصیلات میں مسجد نبویؐ اور باب جبرئیل، باب السلام، باب الرحمۃ اور باب النساء کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ روضۂ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم، ریاض الجنۃ، جنۃ البقیع اور صفہ کی بڑی پر اثر تصویر کشی کی ہے۔ جدہ کے بعد مدینہ منورہ کے ذکر سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف جدہ کے بعد پہلے مدینہ منورہ گئے۔ اس کے بعد مکہ معظّمہ کا سفر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ نہر ہشتم میں مدینہ سے مکہ معظّمہ کے سفر کی روداد تحریر کی ہے (ق ۷۷/الف)۔ نہر نہم آخری باب ہے جس میں مکہ معظّمہ اور وہاں کے مقدس مقامات، خانہ کعبہ، مسجد حرام، غار حرا، غار ثور، شعب ابی طالب اور دیگر مسجدوں کا ذکر بڑے والہانہ انداز میں کیا ہے۔ مکہ کے بازار، عوامی زندگی، طور طریقے، آب و ہوا، قہوہ خانہ اور دیگر سماجی گوشوں پر اچھی روشنی ڈالی ہے (ق ۸۲/الف) اس کے بعد جدہ کی واپسی کا بیان ہے۔ جہاں وہ میر عبداللہ کے گھر پر مقیم تھے۔ اس بیان کے بعد ایک اور باب میں مصنف نے اپنے تجربات کی روشنی میں حجاج کرام کی تین قسمیں (امیر، متوسط، غریب) قرار دے کر ہر ایک کے لیے کچھ ہدایتیں تحریر کی ہیں۔ جن سے حجاج کرام حج کے سفر کی پریشانیوں سے بچ سکیں۔ یہ جلد یہیں ختم ہو جاتی ہے، جلد دوم کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

''المحیط الثانی فی غوص البحار من الاسفار برار باب عقول سلیمہ وار باب فطانت صحیحہ و مشتریان جواہر نفیسہ''۔

یہ جلد جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا سات انہار میں منقسم ہے:

نہر اول جدہ سے مسقط کے بحری سفر پر مشتمل ہے۔ نہر دوم میں خود مسقط کے حالات و

واقعات تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ نہر سوم تا نہر ہفتم میں ایران کے سفر کی روداد اور مشہد، دامغان، سمنان وغیرہ شہروں کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔

۳- حالات الحرمین: یہ شیخ رفیع الدین مراد آبادی کا سفر نامۂ حج ہے۔ یہ شیخ فرید الدین خان کے صاحب زادے تھے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت مراد آباد میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے دہلی گئے اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور پھر حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ سے تفسیر و حدیث کا علم حاصل کیا۔ مولانا خیر الدین سورتی سے بھی کسب فیض کیا اور شیخ محمد غوث گوالیاری کی صحبت میں رہ کر ان کی روحانی تعلیم و تربیت سے بھی فیضیاب ہوئے۔ انہوں نے تصنیف و تالیف کا اعلیٰ ذوق پایا تھا۔ اتحاف النبلا میں ان کی درج ذیل تصنیفات کا ذکر ملتا ہے:

المال والمآل، کتاب الاذکار، تذکرۃ المشائخ، کنز الحساب، شرح اربعین امام نووی، تاریخ افاغنہ، شرح غنیۃ الطالبین، تذکرۃ الملوک، قصر الآمال بذکر ترجمۂ عین العلم، سلوک الکئیب بذکر الحبیب۔ (اتحاف النبلا، ص ۲۵۱) ان کی وفات ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء میں مراد آباد میں ہوئی۔

یہ سفر نامہ ۱۸/محرم الحرام ۱۲۰۱ھ/۱۷۸۶ء سے شروع ہوتا ہے اور ربیع الثانی ۱۲۰۳ھ/۱۷۸۸ء پر ختم ہوتا ہے یعنی مصنف نے تقریباً دو سال حج بیت اللہ کے سفر میں گزارے۔ یہ سفر نامہ ۱۰۰/اوراق پر مشتمل ہے، سال کتابت درج نہیں۔ اس سفر نامہ میں مقدس مقامات کی زیارت کا ذکر ہے۔ خاص طور پر مسجد حرام، بیت اللہ، مسجد جبل ابوقبیس، مسجد جن، مسجد عائشہ، غار حرا، غار ثور، جبل احد، منیٰ، مزدلفہ، مسجد خیف، دار ارقم وغیرہ کا ذکر بڑے خوبصورت اور موثر انداز میں کیا گیا ہے۔ ملا میر داماد، مولوی محبّ اللہ، شیخ عبدالوہاب، سید حسین مفتی مالکی، شیخ عبدالغنی مفتی شافعی مفتی عبدالملک، سید عقیل وغیرہ اہم شخصیتوں سے ملاقات کا ذکر بھی ہے۔ (ق ۵۰/الف)

حکایت کے عنوان سے مختلف بادشاہوں اور علماء و مشائخ کے سفر کے حالات و واقعات بھی بیان کیے ہیں۔ جیسے نظام الملک طوسی، ، منصور بادشاہ اور مصر کے بادشاہ کے حالات ہیں، اس سے کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا ہے۔ حجاز کے عام سماجی و معاشی حالات میں اونٹوں اور گھوڑوں کا ذکر بڑا دلچسپ ہے۔

علامہ شبلی
اور مسلمان خواتین کی تعلیمی و معاشرتی بیداری

شائستہ خاتون

علامہ شبلی نعمانی کی جامع کمالات شخصیت کے عرفان و تعارف میں سوانح نگاروں، محققوں اور نقادوں نے اپنے مطالعے اور ذوق و انداز نظر کے حوالے سے تعبیرات میں جدت کا اظہار کیا ہے، بعض جملے تو ضرب المثل کی حد تک مشہور ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی نے چند سطروں میں علامہ شبلی کی ہمہ جہت شخصیت کو جس انداز میں پیش کیا وہ اختصار میں جامعیت کا شاہکار نمونہ ہے۔ انہوں نے محقق فن، ادیب، شاعر، انشاء پرداز، خطیب، مورخ، متکلم، مفکر، مصلح جیسے الفاظ کا استعمال جس ترتیب سے کیا ہے وہ علامہ شبلی کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے بجائے خود مربوط اشاریہ ہے، ان صفات کے ساتھ یہ جملہ بھی فکر انگیز اختتامیہ کے طور پر قابل لحاظ ہے کہ ''وہ (علامہ شبلی) نئے زمانے کے اقتضاءات اور مطالبات کے مقابلے میں بہت سی باتوں میں انقلابی بھی تھے''۔(۱)

علامہ شبلی کی کتابوں، مقالات و مضامین، مکاتیب اور چھوٹی بڑی تحریروں کے جمع و تدوین اور ان کے متعلق سوانح، مطالعات و تجزیات کا ایک خزانہ ہے جس کا اندازہ، اشاریوں اور کتابیات کی مختلف کاوشوں سے کیا جاسکتا ہے اور جن کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ جہان شبلی کے بیشتر گوشے روشن ہو چکے ہیں، تاہم مطالعات کا قدم نئی راہوں کی جستجو سے بے نیاز بھی نہیں ہوسکتا، کتابیات شبلی کے غائر مطالعہ کے بعد احساس ہوا کہ ہندوستان میں مسلمان خواتین کی تعلیمی و سماجی بیداری کے لیے علامہ شبلی کی کاوشوں کا مستقل اور بالاستیعاب مطالعہ، مطالعات شبلی کے وسیع ترین دائرے میں

ریسرچ اسکالر شبلی نیشنل پی.جی کالج، اعظم گڑھ۔

شامل ہونے سے رہ گیا ہے، چند سال ہوئے ہماری زبان (۲۲ر تا ۲۸ر اپریل ۲۰۰۵ء، ص ۱-۲ و ۷ر مئی ۲۰۰۵ء، ص ۲-۳) دہلی میں مولانا کلیم صفات اصلاحی کا مضمون اسی موضوع پر غالباً جہان شبلی کے اس روزن سے جھانکنے کی پہلی کوشش ہے، لیکن یہ ایک مختصر تحریر ہے، شبلی کے سوانح نگاروں میں شیخ محمد اکرام نے یادگار شبلی میں شبلی اور مسئلہ زن کی ذیلی سرخی ضرور قائم کی لیکن ان کی نظر صرف شبلی کی شاعری اور وہ بھی فارسی شاعری کے ایک خاص محور کے اردگرد محدود رہی، یہ سوال قائم ہی نہیں ہوئے کہ مسلمان خواتین کی تعلیمی اور سماجی بیداری میں علامہ شبلی کی خدمات کیا اور کیسی ہیں؟ اور یہ کہ سرسید و حالی و نذیر اور دوسرے مصلحین کی طرح علامہ شبلی کی کوششوں اور خدمات کا اثر کیا ہوا؟

علامہ شبلی کے متعلق یہ بات معروف اور مشہور ہے کہ ان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں سرسید کی توجہات کا اثر ہے اور غیر معمولی ہے، شبلی کے قاری کے لیے یہ قول بھی بڑا مانوس ہے کہ علامہ شبلی، سرسید کی بزم میں سب کے بعد اور سب کے پیچھے آئے لیکن شہرت، ناموری اور قومی و ملی خدمات کے تنوع میں وہ سب سے آگے نظر آئے۔ سرسید نے غالباً اپنے عہد کی بعض مصلحتوں کے پیش نظر تعلیم نسواں کی جانب اتنی توجہ نہیں کی جو انہوں نے عام مسلمانوں کی جدید تعلیم کے لیے کی لیکن ان کے رفقاء خصوصاً مولانا حالی نے مسلمان خواتین کے مسائل کو پہلی بار موثر ترین اظہار کی شکل دی اور اس کے لیے سرسید کے اثرات کو بنیادی درجہ دیا جانا، عین قرین صواب ہے، خواتین کے تعلق سے مذہبی اصلاح اور بہتری، تعلیمی ترقی اور معاشرتی خود اعتمادی کی فکر اور خواہش اگر علی گڑھ کے قیام اور سرسید کی معیت کے نتیجے میں علامہ شبلی کی فکر میں پیدا ہوئی تو شیخ محمد اکرام کے الفاظ میں یہ امر ناگزیر تھا کہ ذہین اور اہل نظر نو وارد (شبلی) عورتوں کی تعلیم و تربیت اور ان کے نصب العین پر غور کرتے (۲)۔ شیخ صاحب نے اس ناگزیر امر کی وضاحت یہ کہہ کر کی کہ ''علامہ شبلی جب علی گڑھ پہنچے تو ان کے تجربے میں ایک نیا اضافہ ہوا'' (۳)۔ یہاں تجربے کا لفظ بڑا معنی خیز ہے، شبلی علی گڑھ پہنچے تو ان کی عمر ۲۳-۲۴ سال کی تھی، ایک چوبیس سالہ نوجوان کو زندگی کے کتنے تجربات حاصل ہو سکتے ہیں، شیخ اکرام نے اس کی وضاحت تو نہیں کی لیکن تجربے کے ایک نئے اضافے کی ان کی تشریح، خود ان کے طرز فکر کی دلچسپ ترجمان ضرور ہے، ان کے خیال

میں جس ماحول میں علامہ شبلی نے اب تک زندگی گزاری تھی وہاں قدیم قسم کی دلچسپیوں کا سامان تو تھا لیکن خادماؤں اور ایک خاص طبقے کو چھوڑ کر اس ماحول میں نسوانی عنصر مفقود تھا...... ایسے میں ساری فکر اس بات کی ہوتی کہ مردوں کی دنیاوی تعلیم ہو اور کیسے ہو، ایسے ماحول میں عورت کی تعلیم و تربیت پر خاطر خواہ توجہ کس طرح ہوسکتی تھی، لیکن جب مولانا شبلی علی گڑھ آئے اور انگریز پروفیسروں اور ان کی بیویوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا...... تو ان کے لیے یہ امر ناگزیر ہوا کہ وہ عورتوں کی تعلیم و تربیت اور ان کے نصب العین پر غور کریں، شیخ اکرام کے یہ خیالات، ان کے ذہن و فکر کی کیسی ترجمانی کرتے ہیں، اہل نظر خوب واقف ہیں، یہاں یہ ذکر برسبیل تذکرہ یوں آ گیا کہ بہرحال شیخ صاحب شبلی کے تمام سوانح نگاروں میں پہلے اور غالباً اب تک تنہا شخص ہیں جنہوں نے شبلی اور مسئلہ زن کی سرخی قائم کی۔ اگرچہ اس میں رنگ بھرنے کے لیے مسز آرنلڈ، لیڈی بلنٹ اور بعد میں عطیہ فیضی کے خاکداں ہی ملے ورنہ مسلمان خواتین کی تعلیم کے تعلق سے شبلی کی فکر پر ڈپٹی نذیر احمد، مولانا حالی، مولوی چراغ علی کی کرنیں صاف طور پر جھلکتی مل جاتیں، البتہ شبلی کو امتیاز حاصل ہوا تو ان کی اس ذہنی بلندی کی وجہ سے جس کا اظہار سب سے پہلے المامون میں ہوا، سیرت المامون کی لیکن تاریخ درون میں شبلی کے ذریعہ اس زمانہ کی مسلم خواتین کی تصویرکشی ایک شعوری کوشش تھی، انہوں نے ایک جگہ لکھا کہ:

> ''خوش حال لوگوں کے حرم میں داخل تھیں اور چونکہ ان کے حقوق اور معاشرت عملی طور سے ہر خاندان میں اصل ازدواج کے برابر بلکہ بڑھ کر تھے اس لیے عورتوں کی تعلیم اور آزادی کا مسئلہ بہت کچھ ان کی بدولت حاصل ہو گیا تھا''۔ (۴)

مامون الرشید کی دلہن کے تعارف میں لکھا کہ:

> ''یہ خوش قسمت لڑکی جس سے مامون کا نکاح ہوا، حسن بن سہل کی بیٹی تھی جو فضل کے مرنے پر وزیر اعظم مقرر ہوا تھا، اس لڑکی کا نام بولان تھا اور یہ نہایت قابلہ اور تعلیم یافتہ تھی''۔ (۵)

یہ دونوں اقتباسات محض اتفاقی واقعہ نگاری نہیں، بلکہ شبلی ان کے ذریعہ اپنے عہد کے مرعوب ذہنوں کو یاد دلانا چاہتے تھے کہ مسلمانوں کا مذہب اور ان کی معاشرت، شروع سے تعلیم اور تہذیب دونوں لحاظ سے مسلمان خواتین کے معیار کو بلند کرتے رہے۔ وہ انگریز حکومت اور

اس کے حاشیہ نشینوں کی زبان سے اس فریب کا پردہ چاک کررہے تھے، مسلمان عورتوں میں جہالت اور معاشرتی پس ماندگی کا سبب اسلام ہے، انہوں نے خاص طور پر المامون کے دربار میں ان عورتوں کی موجودگی کا احساس دلایا جو موسیقی، شاعری، ادب، خوش نویسی اور حاضر جوابی کے فنون میں کامل ہوکر علم وفن میں یکتائے روزگار تھیں۔

۱۹۸۲ء میں ۳۵ سال کی عمر میں علامہ شبلی نے جب مصر وشام وترکی کا سفر کیا تو ترکی میں مسلمان خواتین کی معاشرت اور تہذیب وترقی کی تعریف پرزور الفاظ میں کی کہ:

> ''وہ پردے کی پابند ہیں لیکن جاہل، دنیا سے بے خبر، مکان کے قفس میں بند حیوان نما انسان نہیں ہیں، لڑکیوں کی تعلیم کے لیے مدرسے کثرت سے ہیں اور پردوں کی حفاظت کا ایسا عمدہ انتظام ہے کہ شرفاء کو اپنی لڑکیوں کے بھیجنے میں کچھ تامل نہیں ہوتا''۔(۶)

ایک جگہ دو مسلم بچیوں کا ذکر اس طرح کیا کہ:

> ''یہ عورتیں نہیں بلکہ عفت وعصمت کی دیویاں ہیں''۔(۷)

چند سال بعد الفاروق شائع ہوئی، ظاہر ہے حضرت عمرؓ کے حالات، فتوحات، ملکی و مذہبی انتظامات، علمی کمالات اور ذاتی اخلاق وعادات کی مرقع نگاری مقصود تھی، خود شبلی کی نگاہ میں یہی ''مصنف کی سعی ومحنت کی تماشا گاہ ہے''، لیکن انہوں نے اس میں بھی مسلمان خواتین کے حقوق و حالات کی جھلکیاں پیش کرنے میں کامیابی حاصل ہی کرلی اور حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل کیا کہ:

> ''ہم لوگ زمانہ جاہلیت میں عورتوں کو بالکل ہیچ سمجھتے تھے، جب قرآن نازل ہوا اور اس میں عورتوں کا ذکر ہوا تو ہم سمجھے کہ وہ بھی کوئی چیز ہیں......''۔(۸)

اس قسم کی روایتوں کی تلاش وذکر سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شبلی اپنے عہد میں مسلمان خواتین کی تعلیم اور اسلام میں ان کے مساویانہ حقوق کا ذکر عمداً اور اس خاص مقصد کے لیے کرتے تھے کہ اسلام نے خواتین کو جو درجہ بلند عطا کیا ہے اس کا اقرار بھی ہو اور اظہار بھی۔

علامہ نے علی گڑھ میں اپنے زمانہ قیام میں مسلسل مضامین سپرد قلم کیے، ۱۸۹۸ء میں وہ علی گڑھ سے رخصت ہوئے تو ان کے مضامین کا ایک مجموعہ رسائل شبلی کے نام سے شائع ہوا اس

میں گیارہ مضامین تھے جو بعد میں مقالات شبلی کی آٹھ جلدوں میں موضوعات کی مناسبت سے شامل کر لیے گئے۔

مقالات شبلی کے مضامین میں پردہ اور اسلام، بلاغات النساء، حضرت اسمأؓ اور حضرت ہندہؓ، زیب النساء، ہمایوں نامہ، الملل والنحل، احمد زکی آفندی کی کتاب انظر فی السفر الی الموتمر ایسے مضامین ہیں جہاں صاف نظر آتا ہے کہ مسلمان مردوں کی طرح عورتوں کو بھی ان کے پرفخر اور باعظمت ماضی کی یاددلائی جارہی ہے، ساتھ ہی شبلی اپنے مقصد کا اظہار بھی کرتے جاتے ہیں، مثلاً زیب النساء کے ذکر میں وہ کہتے ہیں کہ:

''انگریزی مصنفوں کی غلطیاں جو عالم گیر ہوتی جاتی ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ کوئی شخص ان کی پردہ دری نہیں کرتا اور کرتا ہے تو ایسی زبان میں جس کی ان کو خبر تک نہیں ہوتی، اس لیے سلسلہ بہ سلسلہ وہ غلطیاں پھیلتی جاتی ہیں اور ان سے مسلمانوں کے اخلاق وعادات کی نسبت نہایت برے خیالات پیدا ہوتے ہیں''۔(۹)

ہمایوں نامہ بظاہر ایک نادر کتاب کا تعارف ہے لیکن علامہ شبلی اس کے ذریعہ مسلمان عورتوں کے معاشرتی مقام ومرتبہ کی جانب توجہ مبذول کراتے ہیں کہ بابر کی بیوی ماہم بیگم کابل سے ہندوستان آئیں تو بابر دو کوس تک ان کا استقبال کرنے کے لیے پیدل گئے اور جب بیگم کی سواری سامنے آئی اور بیگم نے بابر کو پیدل دیکھا تو سواری سے اترنا چاہا مگر بابر نے روک دیا اور بیوی کی سواری کے ساتھ پیدل مکان تک آیا، اسی طرح علامہ شبلی نے اس نکتے کو واضح کیا کہ ملکی معاملات میں بھی عورتوں سے مشورہ لیا جاتا تھا، عورتوں کو اپنی شادی کے معاملہ میں پوری آزادی حاصل تھا اور اس کی سب سے بڑی مثال ہمایوں اور حمیدہ بیگم کی ہے کہ جب ہمایوں نے بیگم سے شادی کرنی چاہی تو اس نے صاف انکار کیا اور ایک مدت تک اپنے ارادے اور ضد پر قائم رہی، آزادی رائے کے باوجود عورتیں پردہ کرتیں اور بغیر نقاب کے باہر نہیں نکلتی تھیں۔ ہمایوں نامہ کا تعارف پڑھتے وقت صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ محض ایک کتاب کا تعارف ہی نہیں ہے بلکہ اپنے دور کی مسلمان خواتین کو اس احساس کمتری سے نکالنا ہے جو انگریزوں کی وجہ سے عام تھا اور یہ تاثر دینا تھا کہ مسلمان خواتین تعلیم اور معاشرت میں ہمیشہ پس ماندہ رہیں۔

سیرۃ النعمان میں علامہ شبلی نے نکاح کا ایک باب قائم کیا اور لکھا کہ ''بعض یورپین مصنفوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ حنفی فقہ کے مسائل بہت وحشیانہ اور ظالمانہ ہیں لیکن ہم اس بحث میں دکھادیں گے کہ آج مہذب سے مہذب ملکوں میں بھی نکاح کے قواعد، حنفی فقہ سے عمدہ تر نہیں ہیں اور یہ کہ حنفی فقہ کے بموجب قواعد نکاح، مجموعہ انصاف ہیں، بحث کے اس انداز سے صرف الزامات کا جواب ہی نہیں، یہ پیغام بھی مقصود تھا کہ مسلمان خواتین کے تعلق سے دیرپا عمل یہی ہے کہ ان کو اسلام کے قوانین کی حکمت اور مصلحت سے واقف کرایا جائے، چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''عورتوں کو مردوں کے ساتھ جن باتوں میں مساوات حاصل ہے وہ باطل نہ ہونے پائے، چونکہ نکاح سے عورت کو امن و راحت کی توقع ہونی چاہیے نہ یہ کہ اس کے اصل حقوق میں زوال آئے، یہ اسلام کی خاص فیاضی ہے جس کی نظیر اور کسی مذہب میں نہیں مل سکتی''۔(۱۰)

علامہ کے مضامین، مکاتیب اور خطبات کی گیارہ جلدیں شائع ہوئیں لیکن کچھ تحریریں اس پورے مجموعہ میں شامل ہونے سے رہ گئیں، جن کو باقیات شبلی کے نام سے مسلم یونیورسٹی کے کتب خانہ کے اسسٹنٹ لائبریرین جناب مشتاق حسین نے دہلی سے ۶۴ میں شائع کیا، اس میں ایک تحریر 'عورت اور اسلام' کے عنوان سے ہے، یہ دراصل وہ تقریر ہے جو والیہ ریاست بھوپال کی علی گڑھ آمد کے موقع پر علامہ نے کی تھی اور جو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۲۰ر دسمبر ۱۹۱۱ میں شائع ہوئی تھی۔ ایک ریاست کی خاتون حکمراں کی موجودگی میں مسلمان عورتوں کی اہمیت اور تعلیمی احساس کی برتری دلانے کے لیے انہوں نے اس موقع کو بہتر سمجھا اور ایک مختصر تقریر میں وہ تمام باتیں کہہ دیں جن کے لیے ہزاروں صفحات کی ضرورت ہوتی ہے، انہوں نے ہندوستان، عرب، یونان اور انگلستان میں ماضی سے انیسویں صدی کے اواخر تک جو عملی رویہ خواتین کے ساتھ روا رکھا گیا ان کا ذکر کرکے اسلام کے بالکل عہد آغاز میں خواتین اسلام کی خدمات بیان کیں اور پھر مغل حکومت تک ہندوستان میں مسلم خواتین کی منزلت و مساوات کی بھولی بسری داستان سنا کر کہا کہ:

''پردہ مانع تعلیم نہیں ہے اور نہ پردہ کوئی خارج از اسلام شے ہے، کوئی زمانہ ایسا نہیں ہوا کہ مسلمان عورتیں بے پردہ دربار وغیرہ میں شریک ہوتی رہی ہوں، اس کے

خلاف کہنا، اسلام پر سخت اتہام لگانا ہے''۔

یہ بھی کہا کہ:

''فرض کیجیے کہ عورتوں کو تعلیم دلانے کی ضرورت نہیں ہے لیکن آپ مردوں ہی کی تعلیم کے لیے عورتوں کو تعلیم دلائیں کیونکہ بچوں کی تعلیم اس کے وجود میں آنے کے وقت ہی سے شروع ہو جانی چاہیے اور یہ بغیر عورتوں کے تعلیم یافتہ ہونے کے ممکن نہیں''۔

شبلی کا یہ نظریہ تعلیم نسواں کے لیے ایسا بنیادی اصول ہے جو کسی مزید دلیل کا محتاج نہیں ہے۔ یہاں اس کی اہمیت اس سے بھی ظاہر ہے کہ علامہ شبلی کے سامنے سرسید کا وہ خیال بھی تھا جب سرسید نے یہ کہا تھا کہ عورتوں کو فی الحال صرف مذہبی تعلیم دی جائے، باقی مردوں کے بعد عورتوں کی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔(۱۱)

شبلی نے سرسید کے خیال کی مخالفت نہیں کی ہے، سمجھنے کے لیے سرسید اور شبلی کی عمر کے فرق کو پیش نظر رکھنا چاہیے جن میں قریب چالیس سال کا فرق تھا، تعلیم نسواں کے متعلق سرسید کی رائے ۱۸۵۷ء سے پہلے کے اس ماحول کے مدنظر تھی جب ہندوستان میں مردوں کی تعلیم کا رواج بعض خاص خانوادوں کو چھوڑ کر نہ ہونے کے برابر ہو گیا تھا، ایسے میں سرسید کے سامنے اولین مرحلہ مردوں کی تعلیم کا تھا۔

شبلی مسلمان خواتین کی تعلیم کے ساتھ ان کی سماجی بیداری کے لیے جس طرح کوشاں تھے، اس کی ایک بہترین مثال وہ واقعہ ہے جب ۱۹۰۸ء میں نواب بہاولپور کی دادی نے ندوے کی تعمیر کے لیے پچاس ہزار روپوں کی خطیر رقم عنایت کی، یہ ہندوستان کی تاریخ میں گویا حیرت انگیز واقعہ تھا، علامہ شبلی نے اگست ۱۹۰۸ء کے الندوہ میں ایک نہایت پر جوش مضمون لکھا، جس کی تمہید میں امت کی امہات صالحات کا یہ اثر دکھایا کہ ''مذہبی احساس خلوص، مذہبی شیفتگی جس قدر عورتوں میں پائی جاتی ہے مردوں میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں اور یہ کہنا بالکل سچ ہے کہ گو آج ہم میں شبلی اور جنید نہیں لیکن رابعہ اور مریم اب بھی موجود ہیں''۔(۱۲)

پھر لکھا کہ:

''آج ہندوستان میں بڑے بڑے قومی اور ملکی کام چھڑے ہوئے

ہیں اس میں سب سے بڑا مذہبی کام اگر مسلمان خواتین کے ہاتھوں انجام پائے
اور قرآن مجید، حدیث اور اسلامی علوم کو زندہ رکھنے کی کوشش کی جائے تو اس کے
وجود اور بقا میں سب سے بڑا حصہ خواتین کا ہونا چاہیے''۔

انہوں نے مثال بھی دی کہ:

''ندوہ کے مصارف کے لیے جو جائدادیں اب تک وقف کی گئی ہیں
ان میں بیشتر حصہ قوم کی خاتون کا ہے''۔(۱۳)

یہ مضمون مقالات شبلی کی آٹھویں جلد میں شامل ہے اور اسی کے ساتھ بیگم بھاولپور کا علاحدہ ذکر ہے جن کو علامہ شبلی نے 'زندہ زبیدہ خاتون' کے عنوان سے یاد کیا، ان کی فیاضی کو انہوں نے ہارون، مامون، زبیدہ خاتون، برامکہ اور تیموریہ سے نسبت دیتے ہوئے کہا کہ 'موجودہ زمانے میں پرانے آموختہ سے بے نیاز کرنے والی بیگم بھاولپور ہیں' لکھا کہ:

''خاتون محترمہ نے جو فیاضی فرمائی ہے اس نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی نہ
صرف بنیاد مستحکم کردی ہے بلکہ اس کی آیندہ ترقیوں کے لیے راستہ صاف کردیا ہے،
آیندہ زمانہ میں ندوہ جتنی ترقی کرے گا وہ سب اسی فیاضی کا پرتو، اسی تخم کا اثر اور اسی
آفتاب کی شعاعیں ہوں گی''۔(۱۴)

یہ جملے بھی گرمی جذبات سے پگھل کر نکلے کہ:

''اے صبح الہ آباد، اے اودھ تو نہایت وسیع، نہایت ممتاز معزز ملک ہے لیکن سچ
یہ ہے اور اب اس سے خود تجھ کو انکار نہیں کرنا چاہیے کہ پنجاب نہیں بلکہ اس کی ایک
ریاست نہیں بلکہ اس کی ایک خاتون محترم کے آگے تیری گردن ہمیشہ کے لیے جھک گئی
، تو نے کبھی برہان الملک اور آصف الدولہ پیدا کیے ہوں گے لیکن تو کسی زبیدہ حاتون کا
نام نہیں لے سکتا''۔(۱۵)

اسی موقع کی ایک تقریر خطبات شبلی میں بھی موجود ہے جس میں انہوں نے ندوے کے لیے مسلمان خواتین کی فیاضانہ امداد کا پرشکوہ الفاظ میں ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اسی بنا پر یہ دارالعلوم ام المدارس کہلایا جائے تو یہ بے جانہ ہوگا۔

۱۹۱۳ء میں علامہ نے علی گڑھ کے اسٹریچی ہال میں اسلام اور جمہوریت کے موضوع پر تقریر کی، اس میں بھی انہوں نے عورتوں کے حقوق کے ذکر میں فرمایا کہ 'مافوق العادت عقائد کے دلدادہ عورتوں کے حقوق سے نا آشنا ہیں'، اس اجمال کی تفصیل خطبات شبلی میں شامل آخری تقریر میں ہے، یہ تقریر کیا ہے مسلمان عورتوں کے مذہبی و معاشرتی حقوق، امتیازات اور ان کے متعلق روایات اور اشکالات کے جوابات پر مشتمل ایسی شاہ کلید ہے جس سے اسلام کے علم انسانیت کی ہر گتھی سلجھ جاتی ہے، اسی تقریر میں علامہ نے صاف الفاظ میں کہا کہ عورتوں کو اسی حد تک تعلیم دی جاسکتی ہے جس حد تک مردوں کو، پھر فرمایا:

"مجھے اس خیال سے اتفاق نہیں کہ لڑکیوں کے لیے الگ کورس ہو اور لڑکوں کے لیے الگ، دونوں کا نصاب تعلیم یکساں ہونا چاہیے، جہاں میں اس بات کا زبردست حامی ہوں کہ عورتوں کو وسیع حقوق دیے جائیں اور آج کل جو گھروں میں عورتیں مثل لونڈیوں کے ہوتی ہیں، اس کی اصلاح کی جائے اور عورتوں سے بہ طریق مساوات سلوک کیا جائے، وہاں میں اس کا سخت مخالف ہوں کہ عورتوں کی پردہ شکنی ہو، یہ ہرگز قرین مصلحت نہیں"۔(۱۶)

سیرۃ النبیؐ علامہ کا حسن خاتمہ ہے، اگر مہلت حیات اور ملتی تو یقیناً یہ موضوع کچھ اور شان سے نظر آتا، تاہم مولانا سید سلیمان ندوی نے سیرت کی چھٹی جلد میں عورتوں کے حقوق پر جو مفصل بحث کی ہے، اس کو بھی فکر شبلی کی توسیع ہی کہا جائے گا۔

اب تک کے اس مختصر جائزے میں علامہ کی شعری وراثت کی بات نہیں آئی، کلیات شبلی کے تحت ان کے اردو اور فارسی کلام کو جمع کیا گیا جو پہلے دیوان شبلی، دستہ گل، بوئے گل اور برگ گل کی شکل میں شعریات کے چمن میں بکھرا ہوا تھا، کلام شبلی کا چوتھا دور ۱۹۰۸ء سے ان کی وفات ۱۹۱۴ء تک شمار کیا گیا، ان کی سیاسی، تاریخی اور اخلاقی نظم گوئی کا یہی امتیازی دور ہے، ان میں مسلمان عورتوں کے متعلق گرچہ حالی کا رنگ نہیں ہے لیکن ایک خاتون کی آزادانہ گستاخی، عدل جہاں گیری، اظہار اور قبول حق، خواتین عرب کا صبر و استقلال، ایثار کی اعلیٰ ترین نظیر، ہمارا طرز حکومت اور ان کی سب سے آخری نظم، اہل بیت رسولؐ کی زندگی ایسی نظمیں ہیں، جو خواتین اسلام کی اصل عزت و حرمت اور ان کے حقوق اور آزادی فکر کی ترجمان ہیں، حضرت ہندہؓ والی نظم کے آخری شعر میں اس کے

علاوہ اور کیا ہے

لیکن آزادی افکار تھی از بس کہ پسند   آپؐ نے فرطِ کرم سے اسے رکھا مغرور

یا

یوں کی ہے اہل بیت مطہر نے زندگی   یہ ماجرائے دختر خیر الانامؐ تھا

اور ایک معمر مسلم خاتون کے اعتراض پر حضرت عمرؓ کی یہ کیفیت کہ:

سرنگوں ہو کے کہا حضرت فاروقؓ نے آہ   میں نہ تھا اس سے جو واقف تو یہ میری تقصیر

اور نور جہاں کے بارے میں یہ شعر کہ:

اس کی پیشانیٔ نازک پہ جو پڑتی تھی گرہ   جا کے بن جاتی تھی اوراق حکومت پہ شکن

یہ سب مسلمان خواتین کی اہمیت کو اجاگر کرنا ہی تو تھا۔ نواب سلطان جہاں بیگم والیہ بھوپال نے جب دار العلوم ندوہ کو ماہانہ امداد دینے کا اعلان کیا تو علامہ نے فارسی میں قصیدہ پیش کیا اور اس میں عورتوں کی تعلیم و تربیت ہی کو اپنا موضوع بنایا۔

اب تک جو کچھ لکھا گیا وہ علامہ کی تحریر و تقریر کی روشنی میں ہے اور یہی ہمارے موضوع کے لیے کافی ہے لیکن علامہ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، انہوں نے اپنے دائرہ اثر میں کوشش کی کہ دوسرے بھی مسلمان خواتین کی سماجی اور تعلیمی حالت کو بہتر بنانے میں ان کے شریک ہوں، جیسے انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد سے کتاب المرأۃ المسلمہ کے ترجمے کی فرمائش کی، یہ ترجمہ انہوں نے رسالہ الندوہ میں بالاقساط شائع کیا اور اسی ترجمے سے مولانا آزاد کی شہرت کو شہپر ملے، اسی طرح علامہ نے مولانا سید سلیمان ندوی کو سیرت عائشہؓ لکھنے کے لیے تیار کیا، مکاتیب شبلی میں متعدد خطوط ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ کو اس سیرت کا کس درجہ اشتیاق تھا اور انہوں نے کس طرح ان کی رہنمائی فرمائی، ان خطوط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ دیگر ازواج مطہراتؓ کے سوانح مرتب کرنے کی فکر میں تھے، سید صاحب نے ایک جگہ لکھا کہ اگر حالات نے اجازت دی تو نساء اسلام مرتب ہوگی، ظاہر ہے یہ علامہ شبلی کی خواہش ہی تھی جو بعد میں مولانا عبدالسلام ندوی کی اسوۂ صحابیات اور پھر سیر الصحابیات اور مسلمان خواتین کی بہادری جیسی کتابوں کے ذریعہ دار المصنّفین نے پوری کی۔ اس کی تفصیل کے لیے ایک جدا مطالعہ کی ضرورت ہے۔

یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ مذکورہ بالا کوششوں کے ساتھ علامہ شبلی نے اپنے وقت کی مشہور خواتین کو مسلسل عورتوں کی تعلیم و تربیت اور بیداری و ترقی کے لیے آواز دی، بیگم بہاولپور اور بیگم بھوپال کے علاوہ عطیہ فیضی سے مشاورت صرف اسی غرض سے تھی، عطیہ کے نام خطوط اسی اجمال کی تفصیل ہیں۔ صحیح کہا گیا کہ ''اتنا طے ہے کہ علامہ شبلی نے ہر وہ کوشش کی جو مسلمان عورتوں کی خاص طور پر تعلیم اور تہذیب کی ترقی کا ذریعہ بن سکے''۔(۱۷)

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ممبئی کی انجمن اسلام نے اس وقت لڑکیوں کی تعلیم پر خاص توجہ کی اور کم لوگ جانتے ہیں کہ ۱۹۰۶ء میں جب بمبئی یونیورسٹی کے میٹرک امتحان میں پہلی بار تین مسلم بچیوں نے نمایاں کامیابی حاصل کی تو اس کے پیچھے علامہ شبلی کی ان تقریروں کا بھی اثر تھا جو وہ پابندی سے انجمن کی ماہانہ نشستوں میں کرتے تھے۔(۱۸)

علامہ شبلی کی مسلسل کاوشوں کا اثر کیا ہوا۔ یہ الگ موضوع ہے لیکن بیسویں صدی کی ابتدا سے جس طرح عورتوں کے ذریعہ اصلاحی کتب و رسائل کا آغاز ہوا اور خواتین اہل قلم کا شاندار دور شروع ہوا اور خواتین کی تعلیم کا عام اہتمام ہوا اس کے بارے میں اگر یہ جملہ کہا گیا تو مبالغہ نہیں کہ:

> ''گذشتہ صدی کی اسلامی صدی پر صرف اور صرف علامہ شبلی کے اثرات کی عمل داری ہے''۔(۱۹)

حوالہ جات

(۱) حیات شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی، ص ۷۔ (۲) یادگار شبلی، شیخ محمد اکرام، ص ۳۱۶۔ (۳) ایضاً، ص ۳۱۵۔ (۴) المامون، علامہ شبلی نعمانی، ص ۱۶۲، ۱۶۳۔ (۵) ایضاً، ص ۱۵۷۔ (۶) سفرنامہ مصر و شام، ص ۱۱۲-۱۱۳۔ (۷) ایضاً۔ (۸) مقالات شبلی، ج ۵، ص ۱۰۰۔ (۹) سیرۃ النعمان، ص ۲۲۱۔ (۱۰) باقیات شبلی، مشتاق حسین، ص ۱۳۳-۳۴۔ (۱۱) مقالات شبلی، ج ۸، ص ۸۰۔ (۱۲) ایضاً، ص ۸۱۔ (۱۳) ایضاً۔ (۱۴) ایضاً، ص ۸۴۔ (۱۵) ایضاً۔ (۱۶) خطبات شبلی، ص ۹۲۔ (۱۷) شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں، سید شہاب الدین دسنوی، ص ۷۱۔ (۱۸) انجمن اسلام کے سو سال، سید شہاب الدین دسنوی، ص ۲۷۔ (۱۹) علامہ شبلی نعمانی، معنویت کی بازیافت، ڈاکٹر شباب الدین، ص ۱۲۵۔

اخبار علمیہ

''حج سے متعلق رہنما کتابچوں کی طباعت اور مفت تقسیم''

سعودی وزارت مذہبی امور کے سکریٹری ڈاکٹر ساعد الحدیثی نے بتایا کہ سال رواں میں اسلامی عقاید و تعلیمات کے مطابق حج اور عمرہ کی صحیح ادائیگی کے مقصد سے ۳۷ ملین رہنما کتابچے مفت تقسیم کیے جائیں گے، اس کے لیے ۱۶ بحری اور برّی راستوں پر کل ۱۸۰ افسران مامور کیے گئے ہیں، اس کے علاوہ ان نسخوں کی لاکھوں سی ڈیز بھی ہیں اور خادم الحرمین الشریفین کے خاص حکم پر قرآن مجید اور متعدد زبانوں میں مترجم اس کے لاکھوں نسخے بھی بلا معاوضہ عازمین حج کو بطور تحفہ پیش کیے جائیں گے، بلاشبہ یہ قابل قدر عمل ہے۔

(راشٹریہ سہارا نے یہ خبر ریاض نیوز ایجنسیوں کے حوالہ سے ۴/ اکتوبر ۱۳ء شمارے میں نقل کی ہے)

''موریطانیہ میں نادر مخطوطات''

موریطانیہ میں ذاتی کتب خانوں میں نادر مخطوطات اور مختلف علوم وفنون پر مشتمل بڑی اہم کتابیں موجود ہیں مگر چونکہ ان کے بیشتر مالک و وارث ان کی اصل قدر و قیمت اور اہمیت سے ناآشنا ہیں، اس لیے یہ بڑی کس مپرسی اور مخدوش حالت میں ہیں، جب ماہرین مخطوطات ان کو تلف و تباہ ہونے سے بچانے کے لیے ان کے پاس جاتے ہیں تو وہ اپنے مالکانہ حق کے زعم میں ان کو دکھانے میں بھی پس و پیش اور احتراز و گریز کرتے ہیں، ان مخطوطات کے سلسلہ میں ماہرین کا خیال ہے کہ یہ عالم عرب کے سب سے قیمتی علمی ذخائر میں شمار کیے جانے کے لائق ہیں، چونکہ ان کو شہرت عام حاصل نہیں ہوئی اس لیے بھی ان کی جانب توجہ کم رہی اور ان کے متعلق معلومات بھی زیادہ فراہم نہیں ہوسکیں، چند مخطوطات جو بعض لوگوں نے بڑی منت و سماجت سے دکھائے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تمام اسلامی علوم پر مشتمل ہیں، یہ مخطوطات تیسری صدی ہجری سے ۱۴ویں صدی ہجری تک کے ہیں اور تعداد میں یہ ناقابل یقین ۴۰ ہزار سے زیادہ ہیں۔ مشہور

محقق مخطوطات سیدی محمد ولد العربی کا کہنا ہے کہ چونکہ ان مخطوطات پر ان کی اہمیت سے نا آشنا لوگوں کی اجارہ داری ہے، وہ غافل ہی نہیں ان مخطوطات کی حفاظت سے بھی قاصر ہیں، اس لیے اب ماحولیاتی آلودگی کی وجہ سے اس قیمتی میراث کے تلف ہونے کا اندیشہ بڑھتا جارہا ہے۔ ضرورت ہے کہ کیڑے مکوڑوں اور فضائی آلودگی کے اثرات سے ان کی حفاظت کی جائے اور کم از کم مائیکروفلم کے ذریعہ ہی ان کی تصویر کشی سے انہیں محفوظ کردیا جائے۔

(العربیہ نٹ ۱۹/ستمبر ۱۳ء/۱۴/ذوقعدہ ۱۴۳۴ھ)

''اصغر الکتب''

روس میں 0.9 ملی میٹر سائز کی ایک کتاب تیار کی گئی تھی جو سب سے چھوٹی کتاب کی حیثیت سے گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں درج کی گئی تھی، اب جاپان کے ''توتوپان'' نامی شخص نے ۱۲ صفحات پر مشتمل 0.75 ملی میٹر حجم والی کتاب تیار کی ہے، صفحوں پر پھول بنانے کے لیے کرنسی نوٹوں پر استعمال کی جانے والی ٹیکنالوجی کا استعمال کیا گیا ہے، یہ سوئی کی نوک کے برابر ہے، مصنف نے گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں اس کے اندراج کی خواہش ظاہر کردی ہے۔

(منصف حیدرآباد، ۹/اکتوبر ۱۳ء)

''قانون تجرد میں تبدیلی کا فیصلہ''

عیسائیوں میں قانون تجرد صدیوں سے جاری ہے، کونسل آف الویرا کی جانب سے ۳۰۴ ق۔م میں یہ قانون منظور ہوا اور ۱۲۴ء میں پہلی بار اس کو تحریری شکل دی گئی، اس قانون کے مطابق تمام پادریوں کو پابند کیا گیا تھا کہ وہ شادی بیاہ نہیں کرسکتے، کیونکہ روحانیت کے اعلی مدارج کے لیے تجردانہ زندگی ہی مطلوب ہے، مگر اب آرچ بشپ اور ویٹیکن کے نئے سکریٹری کا کہنا ہے کہ پوپ فرانسیسی کا خیال ہے کہ پادریوں کی متاہلانہ زندگی پر غور کرنے اور اس نظریہ کو قابل قبول بنانے کی ضرورت ہے، یہ کوئی آسانی فیصلہ بھی نہیں، ۱۹۷۰ء میں جوزف ریٹزنگر اور ان کے سینکڑوں رفقاء اور ۲۰۱۱ء میں ایک ہزار سے زیادہ جرمن، آسٹرین اور سوئس پادریوں اور

علمائے انجیل نے بھی اس پر کھلے مباحثہ کا مطالبہ کیا تھا اور شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قریب نصف صدی سے ادھر گذشتہ چار دہائیوں سے پادریوں کی خرمستیوں اور بے راہ روی میں مسلسل اضافہ ہوا ہے، جس سے کلب کی بدنامیوں میں اضافہ ہوا اب رہبانیت کے اس منفی پہلو سے نجات پانے کا یہی راستہ ہے کہ قانون فطرت پر عمل کیا جائے۔

(تفصیلی خبر لندن نیوز ایجنسی کے حوالہ سے منصف حیدرآباد نے ۱۵ر ستمبر ۱۳ء میں شائع کی ہے)

''سعودی طلبہ کے لیے انٹرایکٹیو الیکٹرانک کتابوں کی تیاری''

سعودی وزارت تعلیم وتربیت نے طلبہ کو ورقی کتابوں کے بجائے ڈیجیٹل کتابوں کے ذریعہ تعلیم دینے کے منصوبہ کا اعلان کیا ہے۔ یہ اطلاع ڈاکٹر نایف الرومی نے صحافیوں سے گفتگو کے دوران دی۔ انہوں نے بتایا کہ وزارت نے انٹرنیٹ، ویڈیو کلپس، اسمارٹ فون، سی ڈی، ڈی وی ڈی وغیرہ کے ذریعہ تدریس کے جدید طریقوں کو اختیار کرنے کے سلسلہ میں ماہرین سے تبادلۂ خیال اور مشورہ کیا ہے۔ اسی کے ساتھ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کاغذی کتابوں کو بالکل ترک کر دیا جائے گا کیونکہ عالمی پیمانہ پر قرطاس سے بے نیاز ہونا ممکن نہیں ہے، چونکہ بعض ممالک اس جدید طریقہ تعلیم وتدریس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، اس لیے آسانی کی غرض سے یہ طریقہ اختیار کیا جا رہا ہے، انہوں نے یہ بتایا کہ گذشتہ برس شاہ عبداللہ بن عبدالعزیز نے تعلیم کے اس طریقہ کو متعارف کرانے کی تجویز رکھی تھی اور بطور تجربہ انٹر کے طلبہ کو سائنس، ریاضی اور انگریزی پڑھانے کے لیے اس پر عمل کیا گیا، رپورٹ کے مطابق سعودی حکومت نے اس کے لیے ۱۲۰ ملین ڈیجیٹل نسخے تیار کرنے کا جو منصوبہ بنایا ہے، اس پر کروروں ریال خرچ ہونے کا اندازہ ہے۔ (العربیہ نٹ، ۱۹ر ستمبر ۱۳ء)

ک، ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

علامہ شبلیؒ کی نایاب تحریر

عزیز باغ،
نور خان بازار، حیدر آباد
اے۔ پی ۵۰۰۰۲۴
۱۱/ستمبر ۲۰۱۳ء

محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرت شبلی نعمانیؒ کا ایک تبصرہ جو راقم الحروف کے جد امجد نواب عزیز جنگ ولاؔ کی تصنیف تاریخ النوائط پر ۱۹۰۵-۱۹۰۶ میں کیا گیا تھا، مرسل ہے۔ علامہ کی یہ تحریر عدم دستیاب اور اہمیت کی حامل ہے۔ اگر ''معارف'' میں اسے شائع کیا جائے تو مناسب ہے۔ فقط مخلص

حسن الدین احمد
(ریٹائرڈ آئی، اے، ایس)

سید امین اشرف اور تلمیذ رحمٰن

کاشانۂ ادب، سکٹا دیوراج،
پوسٹ بسوریا، وایا لوریا،
مغربی چمپارن بہار ۸۴۵۴۵۳
۲۰۱۳/۹/۲۶ء

محترمی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

علی گڑھ سے اپنی روانگی سے ایک دن قبل سید امین اشرف سے ملاقات کے لیے ''گل کدۂ سمینان'' پر پہنچا تو حسب معمول خندہ پیشانی سے ملے۔ رخصت ہونے لگا تو غم انگیز لہجے میں فرمایا:

''دعا کیجیے گا، زندگی کا کیا بھروسہ؟''۔

کیا خبر تھی کہ ان سے یہ میری آخری ملاقات ہے۔ ۷/فروری ۱۳ء کو عصر بعد میرے چھوٹے بیٹے نے علی گڑھ سے اطلاع دی کہ سید امین اشرف، اللہ کو پیارے ہوگئے۔ (**انا للہ و انا الیہ راجعون**) یہ جاں کاہ خبر بجلی کی طرح رگ و پے میں دوڑ گئی۔ مرحوم پر نالۂ غم کے عنوان سے نظم لکھی تھی جس کا مطلع تھا:

چل بسا دنیا سے اک تلمیذ رب مہرباں
شادماں، خنداں، غزل خواں، سوئے گل زار جناں

جولائی ۱۳ء کے معارف میں ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی صاحب نے شعر مذکور پر یہ اعتراض کیا ہے کہ کسی شاعر کو تلمیذ رحمٰن کہنا دنیا کی جھوٹی باتوں میں سے ایک جھوٹ ہے۔ موصوف کے توجہ دلانے پر میں نے شعر مذکور کو بدل دیا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ علیم ہے اور اس نے اپنے آخری نبیؐ کو دنیائے انسانیت کا معلم بنا کر بھیجا، اس لیے وہ سارے انسان جو نبیؐ کی تعلیمات پر عمل کرتے ہیں وہ سب نبی محترمؐ کے معنوی شاگرد ہیں اور تلمیذ رحمٰن بھی۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد **علم الانسان مالم یعلم** (یعنی جاہل انسان کو عالم بنانے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے) سے یہ بات ثابت ہورہی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کا معلم ہے، لہٰذا اگر کسی راسخ العقیدہ مسلمان شاعر کو تلمیذ رحمٰن کہہ دیا گیا تو اس میں کون سی شرعی قباحت لازم آگئی!

میرا خیال ہے کہ فرمان رسالت: **وان من الشعر لحکمۃ** کے پیش نظر پاکیزہ گو شعراء کی شاعری سے متاثر ہوکر **الشعراء تلامیذ الرحمن** کہا گیا ہوگا، بعد میں ''**الشعراء**'' کے الف اور لام کو استغراق کے لیے قرار دے کر تمام شعراء پر اس کا اطلاق کیا جانے لگا۔ واللہ اعلم بالصواب

جہاں تک قرآن عزیز کی آیت **وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ** (الشعراء:۲۲۴) (یعنی شاعروں کی اتباع بہکے ہوئے لوگ کرتے ہیں) کی بات ہے تو اس آیت میں نفس شاعر یا شاعری کی مذمت نہیں کی گئی ہے بلکہ اس زمانے میں شاعری کا جو غلط رجحان تھا اس رجحان کی مذمت کی گئی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ **اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ** ...... (الشعراء:

۲۲۷) کے مندرجہ ذیل خصوصیات کے حامل:

''۱- مسلمان ہوں۔ ۲- عملی زندگی میں پابند شریعت ہوں۔
۳- کثرت سے اللہ کو یاد کرتے ہوں۔ ۴- اگر ان پر ظلم کیا جائے تو ظلم کے خلاف ہجو کرنے میں حد سے تجاوز نہ کرتے ہوں''۔

شعراء کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔

اسلامی عقائد سے ناواقفیت کی بنا پر قفس رنگ کی منقبت اور اسلام میں غیر شعوری طور پر مرحوم نے ایسے اشعار کہہ دیے ہیں جو اہل سنت والجماعت کے عقیدے سے میل نہیں کھاتے۔ لیکن موصوف صوم وصلات کے پابند تھے، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور رسول اللہؐ کی رسالت پر ان کا پختہ عقیدہ تھا۔ قرآن عزیز میں جن چار خصوصیات کے حامل شعراء کو ''غــاؤن'' سے مستثنیٰ کیا گیا ہے ان میں امین اشرف مرحوم کو بھی بلاشبہ شامل کیا جانا چاہیے۔ مرحوم نے قفس رنگ میں یہ کہہ کر:

ہے بعد از خدا نام خیر الوریٰ
چنیں و چناں ، ایں و آں کچھ نہیں

اپنے راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کا برملا اعلان کیا ہے۔ اس اعتراف نے تو سلام ومنقبت کی قابل اعتراض باتوں پر خط تنسیخ کھینچ دیا ہے۔ والسلام

نیازمند
وارث ریاضی

حوالہ جات کی تصحیح

کھتوال ہاؤس،
۵۴/اے، اسٹریٹ ۱۵،
باتھ آئی لینڈ
کراچی ۷۵۵۳۰۔
۱۹/ستمبر ۲۰۱۳ء

محترم اشتیاق احمد ظلی صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا گرامی نامہ، جو آپ نے ازراہ کرم واحتیاط رجسٹری سے بھیجا، ۱۵/ستمبر کو ملا۔

آپ کے نکات پر میری گذارشات یہ ہیں:

''رسول کریمؐ کی تاریخ وفات'' پر میرا مضمون جون رجولائی ۲۰۱۲ء میں دو اقساط میں شائع ہوا۔ غلطی جولائی کے شمارے میں ہے اور ایک نہیں بلکہ ایک تسلسل سے ہے۔ اس کی واحد وجہ جولائی ۲۰۱۲ء کے معارف میں صفحات ۲۹-۲۸ پر ''حواشی اور حوالہ جات'' کی ازسرنو نمبر ''ایک'' سے نمبر شماری ہے۔ آپ کی سہولت کے لیے میں اس بات کو ایک مثال کے ذریعے واضح کرتا ہوں۔

پہلے جون ۲۰۱۲ء کا شمارہ دیکھیں۔ اس میں ''حواشی اور حوالہ جات'' جو صفحات ۴۲۵ تا ۴۳۰ پر شائع ہوئے ہیں، ان کا نمبر شمار ''ا'' تا ''۳۴'' ہے، جو اس نمبر شماری کے مطابق ہے، جو میرے ہاتھ سے لکھے ہوئے مسودے میں ہے۔

جولائی ۲۰۱۲ء کے شمارے میں ''حواشی اور حوالہ جات'' جو صفحات ۲۹-۲۸ پر ہیں کی نمبر شماری کا آغاز میرے مسودے کے مطابق ''۳۵'' کے عدد سے ہونا چاہیے تھا، تاہم آپ کے ادارے نے آغاز ازسرنو ''ا'' کے ہندسے سے کیا۔ اس سے جس الجھن نے جنم لیا، وہ یہ ہے:

جولائی ۲۰۱۲ء کے شمارے میں صفحہ ۱۰ پر، دوسرے پیرے کے متن کی عبارت اس طرح ہے:

''......یا وہ حضرات تو نہیں جن کا ذکر سید سلیمان ندوی نے ہی اپنی تحریر میں یوں کیا ہے:

''یہ روایت (۲ر ربیع الاول) واقدی سے بھی ابن سعد وطبری نے نقل کی ہے......

(تا) دوئم ربیع الاول کی روایت نقل کی ہے''۔ (۹) جب قاری حواشی اور حوالہ جات میں نمبر شمار (۹) دیکھے گا، جو صفحہ نمبر ۲۸ پر ہے، تو وہاں یہ دیکھے گا:

''(۹) تاریخ الامم والملوک (اردو ترجمہ)۔ نمبر شمار ۲۴ پر درج ہے، ص ۴۳۹، نمبر شمار ۲۴ پر درج ہے۔ ۲۰۰۳ء'' (یہ خاصی پرپیچ عبارت ہے) یہ پڑھ کر جب قاری نمبر شمار ۲۴، صفحہ ۲۹ پر پڑھے گا تو وہاں پڑھنے کو یہ ملے گا:

''(۲۴) الرحیق المختوم (عربی سے اردو ترجمہ)، نمبر شمار ۵۶ (IV) پر درج ہے، ص ۶۱۴ نمبر شمار IV۵۶ پر درج ہے۔ ۲۰۰۳ء'' (وہی پرپیچ عبارت)

سید سلیمان ندوی کی سیرت النبیؐ (جلد دوئم) میں درج تحریر کے لیے معارف میں درج شدہ تاریخ الامم والملوک اور الرحیق المختوم دونوں حوالے غلط ہیں اور پھر نمبر شمار ۵۶ (IV)

کا تو حواشی اور حوالہ جات کی نمبر شاری میں وجود ہی نہیں، یہ نمبر شاری ۲۶ پر ختم ہو جاتی ہے۔

اگر آپ میرے ہاتھ سے لکھے ہوئے مسودے کو نکلوا کر دیکھیں، تو وہاں مضمون کے متن میں صفحہ نمبر ۱۶ پر، سید سلیمان ندوی کے اس اقتباس کے اوپر "۴۴" کا ہندسہ ہے اور حواشی و حوالہ جات کے صفحہ نمبر ۳ پر، نمبر شمار ۶۶ کے سامنے "سیرت النبیؐ (جلد دویم)" درج ہے، نمبر شمار "۹" تو محض مثال ہے جو میں نے قدرے تفصیل سے بیان کردی، ورنہ یہ غلطی تو جولائی ۲۰۱۲ء کے شمارے میں پورے "حواشی اور حوالہ جات" پر محیط ہے۔ ان تسلسل اغلاط کو دور کرنے کے لیے آپ جو مناسب سمجھیں، وہ ضرور کریں، کیونکہ مضمون کا تعلق رسول کریمؐ سے ہے۔ پتہ نہیں کتنے لوگ، کب کب، اسے پڑھتے ہیں؟ برسبیل تذکرہ یہ عرض کردوں کہ اپریل ۲۰۱۳ء کے معارف میں، جب آپ نے آنجنابؐ کے وقت وصال پر میرا مضمون شائع کیا تو صفحات ۲۶۸ تا ۲۷۳ پر میرے بنائے ہوئے حواشی اور حوالہ جات کے "چارٹ" کو اسی Format میں اور عنوانات کے تحت شائع کیا، جس میں یہ مضمون آپ کو بھیجا تھا، اس کی وجہ سے عنوانات کے نیچے مندرجات بالکل واضح ہیں، موجودہ Format میں اگر مندرجات صحیح بھی ہوں تو واضح نہیں۔

اس خط کے ساتھ "فوائد الفواد کے بین السطور تاریخی حقائق پر ایک نظر" کے عنوان سے ایک مضمون قارئین معارف کے ذوق مطالعہ کی نذر ہے، مناسب سمجھیں تو شائع کردیں۔

"رسول کریمؐ کے آخری ایام" کے بارے میں آپ سے پیشگی اجازت اس لیے مانگی تھی کہ مضمون طویل ہے۔ جب "وقت وصال" اور "تاریخ وفات" پر مضامین کئی کئی صفحات پر محیط ہوں، تو ایام کی طوالت تو زیادہ ہونی ہی ہے۔ یہ مضمون کمپوزر کے پاس ہے۔ مکمل ہوتے ہی آپ کو بھجوا دوں گا۔

آپ نے اپنے گرامی نامے میں مجھے جن کلمات سے نوازا ہے، اس کے لیے آپ کا بہت بہت شکریہ۔ کاش یہ کہہ سکتا کہ پاکستان آئیں تو غریب خانے کو جو بابا فریدؒ کی جائے پیدائش سے منسوب ہے، رونق بخشیں۔

والسلام

دعا گو اور دعا جو

فیروز الدین احمد فریدی

آثار علمیہ و تاریخیہ

علامہ شبلی کی ایک نادر تحریر

مکہ معظّمہ میں ایک اسلامی یونیورسٹی کی تاسیس کی تجویز

اشتیاق احمد ظلی

کچھ دنوں پہلے ’الہلال‘ کی ورق گردانی کے دوران مکہ معظّمہ میں ایک اسلامی یونیورسٹی کی تاسیس سے متعلق تجویز پر مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک نوٹ نظر سے گذرا۔ (الہلال، ۳۰ اپریل ۱۹۱۳، ص ۲۹۰)۔ یہ تجویز شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی نے پیش کی تھی اور روزنامہ زمیندار، لاہور میں ۱۵ اپریل ۱۹۱۳ کو شائع ہوئی تھی۔ علامہ شبلی کی تعلیمی خدمات کے سلسلہ میں یہ بالکل نئی اطلاع تھی۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے ’حیات شبلی‘ میں علامہ کی تعلیمی اور ملی خدمات کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے لیکن اس میں مکہ معظّمہ میں ایک اسلامی یونیورسٹی کے قیام کے سلسلہ میں ان کی کسی تجویز کا ذکر نہیں ملتا۔ علامہ شبلی کی حیات اور خدمات پر لکھی جانے والی دوسری کتابیں بھی اس کے ذکر سے خالی ہیں۔ اب زمیندار نایاب ہے اور بڑی جستجو کے بعد بھی کہیں اس کا سراغ نہیں ملا۔ مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی صاحب، استاد مدرسۃ الاصلاح، سے معلوم ہوا کہ اس اخبار کی بعض فائلیں انجمن طلبہ مدرسۃ الاصلاح کی لائبریری ’دار المعلومات‘ میں محفوظ ہیں۔ البتہ اب وہ اتنی بوسیدہ ہوچکی ہیں کہ ان سے استفادہ ممکن نہیں۔ خوش قسمتی سے ایک فائل قدرے بہتر حالت میں تھی اور اس میں مطلوبہ شمارہ موجود تھا۔ ہم مولانا عمر اسلم اصلاحی صاحب کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اس کی ایک کاپی ہم کو فراہم کردی جو ہدیہ ناظرین ہے۔ اس علمی تعاون کے لیے اللہ تعالیٰ ان کو بہترین اجر سے نوازے۔

علامہ شبلی نے یہ تجویز اس وقت پیش کی تھی جب ندوۃ العلماء کے معاملات بہت الجھ چکے تھے اور ان کے اوپر اس کا اثر پڑنا ناگزیر تھا، مولوی عبدالکریم صاحب کی معطّلی ہوچکی تھی اور باہمی کشاکش شباب پر تھی۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے صرف دو مہینہ بعد جولائی ۱۹۱۳ کی ابتدا تک وہ وہاں کے حالات سے اس حد تک دل شکستہ ہوئے کہ دار العلوم کی معتمدی سے استعفا دے دیا۔ دار العلوم سے ان کو جو تعلق خاطر تھا اور اس کی تعمیر و ترقی میں ان کا جو حصہ تھا اس کے پیش نظر آسانی سے

اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے دل و دماغ پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے ہوں گے۔ اس کے علاوہ یہی وہ زمانہ ہے جب وہ ہمہ تن سیرت کی تالیف میں مصروف ہیں۔ جب صورت حال یہ ہو تو کسی اور مسئلہ کی طرف توجہ دینے کی گنجائش کم ہی رہ جاتی ہے۔ لیکن یہاں معاملہ ایک ایسی شخصیت کا تھا جس نے اپنی پوری زندگی قوم کی تعلیم و ترقی کے لیے جہد مسلسل میں صرف کی تھی۔ چنانچہ ایسے وقت میں بھی وہ اپنے اس فرض کی ادائیگی سے کیوں کر غافل رہ سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ کثرت کار، آلام و مصائب کی یورش اور مسلسل بیماریوں کے باوجود آخر تک ملی بہبود ترقی کے کاموں میں ان کا انہماک پہلے ہی کی طرح باقی رہا۔ اس نقطۂ نظر سے ان کی زندگی کے آخری ایام کا مطالعہ بڑا اسبق آموز ہے۔

اس تجویز پر کئی ردعمل بھی سامنے آئے جو الہلال اور زمیندار میں شائع ہوئے۔ مولانا آزاد نے اس تجویز کی تائید کی۔ البتہ ایک نئی یونیورسٹی قائم کرنے کے بجائے مدرسہ صولتیہ کو ترقی دے کر اسے یونیورسٹی بنانے کی تجویز پیش کی۔ مدرسہ صولتیہ تقریباً چار دہے قبل ۱۲۹۲ھ میں مکہ معظّمہ میں ایک ہندوستانی عالم مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے ذریعہ قائم کیا گیا تھا اور دینی تعلیم کی توسیع و اشاعت میں مصروف تھا۔

جامعہ اسلامیہ (یونیورسٹی) کی تجویز

از شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی

واقعات حال نے ایک ایک شخص کو آنکھوں سے دکھا دیا کہ اسلام (یعنی مسلمان) آفتاب لب بام ہورہا ہے۔ اگر عام مسلمان اپنی تمام قوت ایک اجتماعی صورت میں صرف نہ کریں گے تو اب ان کی بقا کی امید نہیں۔ یہ خیال عام ہوتا جاتا ہے لیکن افسوس کہ تدبیر میں اختلاف ہے اور کوئی خاص مشترک رائے نہیں قائم ہوتی۔

میرے نزدیک سب سے مقدم تجویز یہ ہے کہ مکہ معظّمہ میں ایک جامعہ اسلامیہ قائم کی جائے جس میں تمام مذہبی اور دنیوی (جن میں علوم جدیدہ بھی شامل ہیں) علوم کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ آج ہر قسم کی قوت علم پر موقوف ہے اور دراصل علم ہی اصل طاقت ہے۔ اس لیے آج کل ہر قوم کی بقا اسی پر موقوف ہے وہ تمام علوم وفنون میں کامل ہو۔ مکہ معظّمہ میں جامعہ اسلامیہ کے قائم کرنے کی ترجیح کی متعدد وجوہ ہیں:

۱- مکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا مرکز ہے اور ہر ملک کے مسلمان بہ شوق و رغبت وہاں تعلیم حاصل کرنے کے لیے جاسکتے ہیں، مصر یا قسطنطنیہ یا کسی اور مقام میں یہ کوشش نہیں ہوسکتی۔

۲- جس قدر سرمایہ کثیر مکہ معظّمہ کی جامعہ کے لیے مہیا ہے اور کسی مقام کے لیے نہیں ہوسکتا۔

۳- ہر سال اگر حجاج سے صرف دس روپیہ (؟) فی کس وصول ہو تو لاکھوں کی رقم وصول ہوسکتی ہے۔

۴- مکہ معظّمہ میں نہایت عمدہ کتب خانہ موجود ہے۔

۵- مکہ معظّمہ سے قریب طایف نہایت سرد اور خوشگوار مقام ہے اور گرمیوں کے زمانہ میں طلبہ اور اساتذہ وہاں بسر کر سکتے ہیں۔

۶- بڑا مقصد اس تجویز سے یہ حاصل ہوگا کہ عرب کے تمام قبائل جو ہزاروں برس سے اب تک جاہل رہتے آئے ہیں ان میں تعلیم پھیلے گی اور اس غرض کے لیے مختلف بڑے بڑے قبائل میں جامعہ اسلامیہ کی شاخیں قائم کی جائیں گی۔ اعراب اور بدوؤں کو وظایف کے ذریعہ سے علم کی ترغیب بہ آسانی ہوسکتی ہے۔

اس کام میں کسی قدر دقت یہ ہے کہ ٹرکی کی گورنمنٹ مشکل سے اس کی اجازت دے گی کیونکہ ترکوں نے کبھی نہیں یہ چاہا کہ عربوں میں علم وتہذیب پھیلنے پائے چنانچہ بڑے بڑے صدر مقامات میں ایک بھی بڑا سرکاری مدرسہ نہیں لیکن اب ترکوں کی آنکھیں کھل گئی ہیں اور ہندوستان کے مسلمانوں نے ترکوں پر اپنی جاں نثاری کے اتنے حقوق قائم کردیے ہیں کہ اگر تمام مسلمان متفقاً اس قسم کی درخواست ترکی سے کریں تو وہ انکار نہ کر سکے گا۔

یہ بھی ضرور ہے کہ اس تجویز کو کسی قسم کا پولیٹیکل رنگ نہ دیا جائے۔ یہ صرف ایک علمی تجویز ہے اور یوں تو آج کل ایک ایک بات یہاں کی آب وہوا میں پولیٹیکل بن گئی ہے، اس کا کہاں تک لحاظ کیا جاسکتا ہے۔

اگر یہ تجویز پسند کے قابل ہو تو سب سے پہلے اسلامی اخباروں سے استدعا کرتا کہ وہ تمام قوم کو اس کی طرف متوجہ کریں اور بالخصوص قومی درد والوں مثلاً آغا خاں صاحب، راجہ علی محمد خاں صاحب، نواب صاحب ڈھاکہ، قزلباش خاں، نواب وقارالملک، آفتاب احمد خاں، مسٹر محمد علی، ایڈیٹر صاحب 'الہلال' کہ یہ کام آپ سے زیادہ مفید اور سب سے زیادہ ممکن الحصول ہے۔

میں بہ ایں شکستہ پائی یہ کرسکتا ہوں کہ اس کے لیے تمام ہندوستان کا دورہ کروں اور پھر ہجرت کرکے مکہ معظّمہ چلا جاؤں اور اس مبارک جامعہ میں جاروب کشی کی خدمت انجام دوں۔

(روزنامہ زمیندار، ۱۵ اپریل ۱۹۱۳)

ولاؔ کی ایک اہم تصنیف تاریخ النوائط

''علامہ شبلی نعمانی نے نواب عزیز جنگ ولا کی کتاب پر اظہار خیال کیا تھا، یہ قیمتی تحریر گویا اب نایاب ہے اسی لیے جناب حسن الدین احمد نے اس کو خاص طور پر ''معارف'' کے لیے ارسال کیا ہے۔البتہ یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ تحریر کہاں شائع ہوئی''۔

قدیم زمانے میں شخصی سلطنت کے اصول نے فن تاریخ پر یہ اثر کیا تھا کہ تاریخی تحقیقات میں جو کچھ لکھا جاتا تھا صرف سلاطین کے واقعات اور حالات ہوتے تھے۔ملک اور قوم کے حالات سے مطلق بحث نہیں ہوتی تھی یہی سبب ہے کہ سینکڑوں ہزاروں تاریخوں کو پڑھ کر اگر پتہ لگانا چاہو کہ اس زمانہ کا تمدن اور تہذیب و معاشرت کیا تھی تو تم کو ناکامی ہوگی لیکن اب مغربی تہذیب کے اثر نے یہ حالت بالکل بدل دی ہے آج سب سے زیادہ جس چیز کی تلاش ہے وہ قومی اور ملکی معاملات ہیں اور موجودہ تصنیفات میں خصوصیت کے ساتھ ان ہی باتوں کا لحاظ کیا جاتا ہے لیکن یہ انداز ہ صرف زمانہ حال کی تاریخ میں نبھ سکتا ہے کیونکہ قدیم ذخیروں میں یہ سامان بہت کم موجود ہے اس لیے آج کتنی ہی کوشش اور کاوش کی جائے پوری کامیابی نہیں ہوسکتی۔ایسی حالت میں اگر کوئی مصنف غیر معمولی دیدہ ریزی سے اس قسم کے کچھ واقعات بہم پہنچائے تو بے انتہا قدر دانی کا مستحق ہوگا۔ہم جس کتاب پر ریویو کررہے ہیں اسی قسم کی ایک کامیاب تصنیف ہے، ابتدائے اسلام سے عرب وعجم کے سینکڑوں خاندان ہندوستان میں آکر آباد ہوئے،جن کے کارنامے چہرہ تاریخ کے خط وخال ہیں۔ان ہی میں نوائط کا خاندان ہے جو آج سے سینکڑوں برس پہلے ہندوستان میں آیا اور بڑی کامیابی کے ساتھ مدراس اور دکن کے حصوں میں پھولا پھلا۔آج یہی خاندان امتیاز کے ساتھ قائم ہے اوراس کی یادگاریں ہر جگہ ایک خاص نام ونمود رکھتی ہیں یہ کتاب اسی خاندان کے حالات میں نواب عزیز جنگ بہادر کی تصنیف ہے،اگر چہ نواب صاحب کو اس مرحلے کے طے کرنے میں محض قدیم تصنیفات سے مدد ملی ہے کیونکہ اسی خاندان کے مصنّفین نے انساب النوائط وغیرہ کے عنوان سے دو ایک کتابیں لکھی ہیں جو اس مرحلہ میں گویا چراغ راہ ہیں۔ لیکن نواب صاحب نے جس قسم کے واقعات اور حالات بہم پہنچائے ہیں ان کے لحاظ سے یہ تصنیف گویا

اس باب میں پہلی تصنیف ہے، کتاب کے دیباچہ میں مضامین کی جو فہرست ہے اس سے بہ آسانی دعویٰ کی تصدیق ہوسکتی ہے یہ ضرور ہے کہ ایسی تحقیقات کے بہم پہنچانے میں چونکہ ہر قسم کی تصنیفات کا اعتبار کرنا پڑا ہے اس لیے ایک نکتہ چیں کو اعتراض کا موقع ہاتھ آسکتا ہے مثلاً صفحہ (۲۹) میں محدث طبری کی جو عبارت نقل کی ہے وہ اصل کتاب سے نہیں بلکہ گلستان نسب اور آزاد بلگرامی کے حوالہ سے ہے اصل کتاب آج چھپ گئی ہے اور اس میں عبارت کا ہم کو پتہ نہیں ملتا۔ لیکن اس قسم کے امور میں اوروں کی رائے کا پابند نہیں ہوسکتا وہ کہہ سکتا ہے کہ جس شخص نے حوالہ دیا ہے وہ مثبت ہے اس لیے ممکن ہے کہ اس نے طبری کی چودہ جلدوں میں سے کسی موقع پر یہ عبارت دیکھی ہو جب تک اتنی بڑی کتاب کا لفظ لفظ مطالعہ نہ کیا جائے ایک معتبر ناقل کے حوالہ کو غلط نہیں کہا جاسکتا۔

آج کل دلی اور لکھنؤ والوں نے زبان کی پابندی کا بڑا شور وغل مچا رکھا ہے تذکیر و تانیث کے متعلق ان نخوت پرستوں کی خاطر ملحوظ رکھنے میں ایک ایسے مصنف کو بہت سی مجبوریاں ہیں جس کی مادری زبان دکھنی ہے۔ کسی دوسری زبان کے محاورہ میں علم کے ذریعہ سے کیسی ہی قابلیت بہم پہنچائی جائے لیکن کسی نہ کسی موقع پر مادری زبان کی جھلک ضرور نظر آجاتی ہے مثلاً نواب صاحب نے یادگار کو کہیں مونث لکھا ہے اور کہیں مذکر لیکن دلی اور لکھنؤ والے اس کو عموماً مونث لکھتے ہیں۔ ہمارے خیال میں فرہنگ آصفیہ کی تحقیق نواب صاحب کے لیے کافی ہے اسی قسم کے اور جزئیات ہیں لیکن یہ ایسی چھوٹی باتیں کتاب کی قدر و قیمت کو کم نہیں کرسکتیں، ہم بہرحال نواب صاحب کی تحقیقات و تدقیقات کی داد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ تمام ملک ایسی نادر تصنیف کی قدر کرے گا۔

باب التقریظ والانتقاد

مذہب مختار ترجمہ وحواشی معانی الاخبار

ڈاکٹر محمود حسن الہٰ آبادی

مولف امام ابوبکر محمد بن اسحاق کلاباذی ، ترجمہ وتحشیہ : مفتی عزیزالرحمٰن بجنوری ،
صفحات ۶۰۸ ، اشاعت ۱۹۷۸ء ، کاغذ معمولی ، قیمت : ۴۰ روپئے ، ناشر حضرت پیر محمد
شاہ درگاہ شریف ٹرسٹ ، احمد آباد ، ملنے کا پتہ : مدنی دار التالیف ، بجنور ۔

احادیث کی جمع وترتیب میں بہت سے طریقے اپنائے گئے ہیں ۔ صحاح ، سنن ، مسانید ، معاجم اور مستدرکات کے علاوہ مسلکی تائید میں بھی احادیث جمع کی گئی ہیں ۔ ایسے ہی مجامع میں یہ مجموعہ ’معانی الاخبار‘ ہے جس میں مولف نے مسلک تصوف کی تائید میں احادیث کو جمع کیا ہے ۔ تصوف انفرادی تزکیہ کا وہ شعبہ ہے جس کی تائید میں ضعیف اور موضوع احادیث سے استناد ، استحسان کے درجہ میں سمجھا جاتا ہے ۔ کتاب زیر نظر میں ایسی احادیث موجود ہیں جن کی طرف مترجم اور محشی نے بھی اشارہ فرمایا ہے ۔

صاحب ترجمہ وتحشیہ مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری صاحب نے اپنے ابتدائیہ میں مولف کتاب کے ترجمہ کے تحت یہ بات بتائی ہے کہ کلاباذی بخارا کے رہنے والے ایک معروف صوفی تھے ۔ ان کا نام ’حدائق الحنفیہ‘ میں مذکور ہے ۔ ان کے فقہ کے استاد ابوحفص ، امام بخاریؒ کے معاصر تھے ۔ زیر نظر کتاب میں جو روایتیں جمع کی گئی ہیں ان کے راویوں میں مترجم نے بیس آدمیوں کے نام گنائے ہیں ۔ فقہ میں ان کا سلسلۂ اسناد امام ابوحنیفہؒ تک تین واسطے سے منتہی ہوتا ہے ۔ ان رواۃ میں محمد بن فضل اور الحاکم الشہید کے نام بہت اہمیت کے حامل ہیں ۔

مترجم کتاب نے ’معانی الاخبار‘ کے بارے میں جو چند معلومات فراہم کی ہیں ان کا جاننا قارئین کے لیے ضروری ہے ۔ سب سے اہم بات انھوں نے یہ بتائی ہے کہ یہ مولف کی خود نوشت نہیں ہے بلکہ ’’ان کے حلقہ درس یا حلقہ رشد وہدایت میں مختلف اوقات میں کسی شاگرد رشید

یا عقیدت مند کی قلم بند کی ہوئی مشکل احادیث پر شیخ کی تقریر ہے'' (ص۔۱۲)۔ مترجم نے بتایا ہے کہ مولف (شیخ) نے تمام احادیث کو سند کے ساتھ بیان کیا ہے۔ لیکن کتاب میں مذکور کسی حدیث میں سند کا ذکر نہیں ہے بلکہ ہر جگہ 'سند متصل' کے الفاظ مرقوم ہیں۔ مترجم نے یہ بھی بتایا ہے کہ پوری کتاب میں کہیں بھی کسی عنوان یا باب کا ذکر نہیں ہے۔ احادیث کی تبویب اور فہرست مطالب کی فراہمی خود مترجم محترم نے کی ہے۔ مترجم محترم نے یہ بات بھی بتائی ہے کہ ''احادیث کی تشریح میں مشکل موضوعات کو اختیار کیا گیا ہے .... احادیث کی شرح اور تقریر عارفانہ رنگ میں ہے''۔ مترجم نے یہ بھی لکھا ہے کہ زیر نظر کتاب کے بہت سے نسخے پائے جاتے ہیں لیکن کوئی بھی نسخہ اغلاط سے محفوظ نہیں ہے۔ مترجم نے عبدالملک بن احمد بن حسن المعروف بہ خلیفہ کے مخطوطہ پر کام کیا ہے۔ اس نسخہ کا بھی کوئی صفحہ اغلاط سے خالی نہیں تھا۔ مترجم کو کتاب کے ترجمے سے اس قدر رغبت تھی کہ ایک دن میں پچاس پچاس صفحات کا ترجمہ وہ مکمل کرلیا کرتے تھے۔

کتاب 'معانی الاخبار' اصلاً تصوف کی کتاب ہے۔ لیکن اس میں جو احادیث جمع کی گئی ہیں ان سے تصوف کے مذہب مختار کی شہادت پر دلیل قائم کی گئی ہے۔ جیسا کہ پیشتر عرض کیا گیا مولف نے احادیث کی تبویب نہیں کی تھی لیکن مترجم نے کتاب کو بارہ ابواب میں تقسیم کیا ہے اور ہر باب میں ذیلی عنوانات قائم کیے ہیں۔ جن پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولف نے تزکیہ واحسان کے علاوہ دین کے بہت سے امور پر گفتگو کی ہے۔ اخلاق و معاشرت کے ذیل میں انسانی نفسیات کی کیفیات بھی زیر گفتگو آئی ہیں۔ فضائل وآداب کا بھی اس میں ذکر ہے۔ معصیت، کفارہ، عذاب، مغفرت اور فتنوں کا بھی بیان ہے۔ یہ تمام باتیں امور دین میں شامل ہیں۔ مولف علیہ الرحمہ نے یہ ساری باتیں کہیں براہِ است احادیث نقل کر کے کی ہیں اور کہیں احادیث سے استناد کیا ہے۔ مولف نے تصوف کی بہت سی شطحات کو بھی جائز ٹھہرانے کی کوشش کی ہے جن میں ضعیف اور موضوع احادیث سے استشہاد ہے۔

بارہ ابواب کے تحت مولف نے اصلاً جو احادیث بیان فرمائی ہیں ان کی تعداد ترتیب وار حسب ذیل ہے:

(۱) مقام محبت، خلت، عشق ۶ احادیث (۲) قرآن پاک اور اس کی عظمت ۱۱ احادیث

(۳) آئینہ سیرت النبیؐ ۱۳ احادیث (۴) سیرت انبیاء علیہم السلام ۸ احادیث

(۵) فضائل اور مناقب ۱۷ احادیث (۶) مومنین اور حالات مومنین ۲۹ احادیث

(۷) اخلاقیات اور حقائق اعمال ۲۳ احادیث (۸) حسن معاشرت اور اعمال صالحہ ۸ احادیث

(۹) چند آداب وفضائل ۱۹ احادیث (۱۰) معاصی، کفارات وعذاب اور بعض علامات قیامت ۱۷ احادیث

(۱۱) مغفرت اور انعامات ۷ احادیث (۱۲) منتشرات ومتفرقات ۱۵ احادیث

لیکن مذکورہ تمام ۱۷۳ / احادیث کی تشریح میں مولف نے مزید احادیث اور قرآن کی آیتوں کے حوالوں سے استدلال کیا ہے۔ مولف کا شمار طبقہ محدثین کے زیریں درجہ میں ہوتا ہے۔ ان کی ایک کتاب 'رجال صحیح بخاری' بھی ہے جس کا ذکر مترجم نے نہیں کیا۔ لیکن تعجب ہے کہ مولف مرحوم نے پوری کتاب میں اسناد کا استعمال کہیں نہیں کیا جو احادیث کی صحت کو جانچنے کے لیے شرط اولین کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسے مولف کی سہل نگاری سمجھا جائے یا تصوف کی کارفرمائی؟ مترجم نے بھی جو غالباً حدیث کے استاذ ہیں اسناد نہیں فراہم کیے لیکن احادیث کی صحت، ضعف یا موضوعیت کی صراحت کردی ہے۔ تاہم انہوں نے مولف کی تشریحات وتوضیحات پر کوئی نکیر نہیں کی۔ یہ اہالیان تصوف کی خاص کمزوری ہے کہ جب مقامات حال کی بات آتی ہے تو وہ میزان قال سے گزر جایا کرتے ہیں۔ اس کے نمونے اس کتاب میں بعض جگہوں پر پائے جاتے ہیں۔ مبصر ان میں سے چند ایک کی طرف اشارہ کرے گا۔

باب اول میں محبت، خلت اور عشق کا بیان ہے۔ واضح رہے کہ میزان اگر قرآن وسنت ہے تو اس میں محبت اور خلت کا وجود تو ہے لیکن عشق کا کہیں گزر نہیں۔ اس لیے اگر صوفیائے کرام تواصل بالحق کے لیے عشق الٰہی کو معیار بناتے ہیں تو وہ اپنا معیار انبیاء کرام علیہم السلام سے بھی بلند رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کتاب زیر تذکرہ میں درست طور سے اطباء کے حوالے سے عشق کو بطور ایک مرض کے پیش کیا گیا ہے۔ حکیم بوعلی سینا کا تو ایک رسالہ ہی 'فی ماھیۃ العشق' ہے جس میں اسے ایک نفسیاتی (psychiatric) مرض قرار دیا گیا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ

منصور حلاج سے لے کر سرمد تک کتنے ہی صوفیوں نے اپنی جانیں اس لیے دی ہیں کہ وہ عشق الٰہی میں صحو سے گزر کر سکر تک پہنچ گئے تھے اور انہیں اپنی بھی خبر نہیں رہ گئی تھی۔ اکابر صوفیہ کے نزدیک چونکہ تواصل بالحق کا راز ان لوگوں نے عوام پر آشکارا کر دیا تھا اس لیے انہیں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا تھا۔

مولف نے اس باب میں محبت اور خلت کا جہاں ذکر کیا ہے وہاں قرآن، حدیث اور بزرگان دین کے حوالے ہیں لیکن عشق کے ذیل میں مولف نے امرأۃ العزیز کے **قد شغفها حبا** کو مثال میں پیش کیا ہے۔ یہ قیاس مع الفارق اور قرآن کی آیت کو اصل مبنی سے ہٹا کر اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنے کی ایک نہایت بری مثال ہے۔ عزیز مصر کی بیوی کی خواہشات نفسانی سے قطع نظر آیت میں لفظ عشق نہیں بلکہ 'حبا' ہی استعمال ہوا ہے۔ اسے عشق پر محمول کرنا صوفیانہ کرامت ہی سمجھا جائے گا۔ فاضل مولف نے عشق کے جذبہ کو عصمت اور کتمان کی دو شرائط سے مشروط کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ تمام مکروہات مقاصد شریعت میں داخل ہیں؟ لیکن دین تو ایک کھلی ہوئی کتاب ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ سے کہتا ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَآ أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ (المائدۃ:۶۷)	اے رسول! جو کچھ آپ کے اوپر نازل کیا گیا اسے (لوگوں تک) پہنچا دیجیے۔ اگر آپ نے یہ کام نہ کیا تو کار رسالت ہی انجام نہیں دیا۔
اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا (المائدۃ:۳)	آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا، تمہارے اوپر اپنی نعمتیں تمام کر دیں اور تمہارے لیے دین اسلام پر راضی ہو گیا۔
وَ مَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ (التکویر:۲۴)	وہ (رسول) تمہارے لئے غیب کے معاملے میں بخیل نہیں ہے۔

معلوم ہوا کہ رسول کو دین جتنا وحی کیا گیا آپ نے اسے پورا کا پورا امت کو پہنچا دیا۔

اب اسلام مکمل ہو چکا ہے، اس میں نہ کوئی نئی چیز داخل کی جاسکتی ہے نہ ہی کوئی چیز اس سے خارج کی جاسکتی ہے۔ اور رسولؐ کو علم غیب جتنا عطا ہوا تھا وہ بھی بلا کم و کاست آپؐ نے امت کو پہنچا دیا۔ ان آیتوں کی روشنی میں ارباب تصوف کے اس دعوی کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے کہ اہل قلوب کے لیے بعض اسرار کا کھولنا منع ہے اور اس اسرار کو کھولنے ہی کی وجہ سے منصور اور سرمد کو سولی پر چڑھنا پڑا۔

کتمان کے ذیل میں ظاہر و باطن کی بات آتی ہے۔ مولانا روم نے بھی فرمایا ہے ؎

من ز قرآں مغز را برداشتم   استخواں پیش سگاں انداختم

تو اس میں مغز اور استخواں سے کیا مراد ہے اور استخواں وہ کن لوگوں کے لیے چھوڑ دیتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ اہل ظاہر کے لیے۔ کیا اسی ثنویت کا نام تصوف ہے اور کیا یہی ثنویت اسلام کو مطلوب ہے؟

متذکرہ نکتہ سے ہٹ کر جتنی بھی باتیں کتاب میں کہی گئی ہیں سبھی دل پذیر اور دین کی تشریح میں ہیں۔ اگرچہ ان میں بہت سی روایتیں ضعیف اور موضوع بھی ہیں جن کی طرف خود مترجم محقق نے اشارے کردیے ہیں۔ اسلام ایک واضح اور مبنی برعقل دین ہے۔ اس کی ہر چیز ظاہر ہے۔ قرآن کا ایک مخصوص علم کلام ہے جو آفاق و انفس کے دلائل سے پر ہے۔ اس کا مطالبہ ہے کہ اسے زمین پر قائم کیا جائے۔ تصوف کی دنیا اس کے برخلاف زہد و ترک دنیا سے عبارت ہے۔ اس کا جتنا تعلق تزکیہ اور تقویٰ سے ہے وہ 'احسان' کے تحت مطلوبات دین میں سے ہے۔ لیکن اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ ذوقی اور نا مطلوب ہے۔

اسی طرح صفحہ ۳۳۸ پر حضرت ابوسعید خدریؓ سے ایک روایت 'ابدال' کے تعلق سے ہے۔ واضح رہے کہ 'غوث'، 'قطب' اور 'ابدال' وغیرہ جیسی صوفیانہ اصطلاحات دینی ہرگز نہیں ہیں۔ حدیث مذکور کے تعلق سے مترجم محقق نے حاشیہ میں یہ بات صاف کردی ہے کہ 'ابدال امت کے بارے میں جس قدر احادیث مروی ہیں وہ سب ضعیف ہیں اور ابن جوزی وغیرہ نے ان کو موضوع بھی قرار دیا ہے'۔ لیکن برا ہو ذوق تصوف کا کہ مترجم محترم نے بھی ابدال کی مشروعیت کے بارے میں کچھ آثار کی نشان دہی کی ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس کا ذکر بھی ملا علی قاری کی 'کتاب الموضوعات'

کے حوالے سے ہے۔ یہ تمام بے سروپا باتیں حضرت علیؓ سے منسوب کی جاتی ہیں۔ جس خوش عقیدگی کے تحت واضعین حدیث نے موضوع حدیثیں روایت کی ہیں اسی خوش عقیدگی سے ہمارے ارباب تصوف اسے قبول بھی کرلیا کرتے ہیں۔ علماء کے تصوف کے مروجہ تصور سے اختلاف کی وجہ بھی یہی ہے۔

صفحہ ۴۸۶ پر مترجم محترم نے عنوان قائم کیا ہے 'عورتیں فاسق ہیں'۔ اس عنوان کے تحت عبدالرحمٰن بن اشہل کی روایت بحوالہ 'جمع الفوائد' نقل کی گئی ہے۔ کہ **ان الفساق هم اهل النار** یعنی فساق جہنمی ہیں۔ اس کی تشریح میں صحابہؓ کے سوال کے جواب میں رسول اللہؐ کا قول نقل کیا ہے کہ اس سے مراد عورتیں ہیں۔ پھر ایک طویل گفتگو کے تحت بتایا گیا ہے کہ عورتوں کی تعداد ترک شکر اور ترک صبر کی وجہ سے جہنم میں زیادہ جائے گی۔ ناچیز مبصر اس موقعہ پر یہ عرض کرنا چاہے گا کہ اس حدیث کی تحقیق کی ضرورت ہے کہ آیا ان الفاظ کے ساتھ یہ حدیث ثابت بھی ہے یا نہیں؟ مفہوم کے اعتبار سے جزوی طور سے یہ بات صحیح ہے لیکن اسے کلیہ کے طور پر پیش کرنے کے لیے مزید تحقیق کی ضرورت ہے کیونکہ اس سے عورتوں کی بہت غلط تصویر سامنے آتی ہے۔ دراصل اس کی تشریح حضرت ابوہریرہؓ کی صحیح حدیث کی روشنی میں ہونی چاہئے جس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ 'نحوست تین چیزوں میں ہے، عورت، گھوڑا اور مکان'۔ اس پر حضرت عائشہؓ کا معارضہ ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کو سننے میں غلطی ہوئی ہے۔ دراصل رسول اللہؐ نے فرمایا تھا کہ اگر نحوست ہوتی تو تین چیزوں میں ہوتی۔ اس طرح عورتوں کی نحوست یا فسق کے بارے میں اطلاق نہیں ہے بلکہ تبعیض ہے۔

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری صاحب نے نہایت شگفتہ اور سلیس اردو میں کتاب کا ترجمہ کیا ہے اور کہیں کہیں اپنی تشریحات سے نوازا ہے۔ اس سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوا ہے۔ انہوں نے کلاباذیؒ کی پیش کردہ تقریباً تمام احادیث کی تخریج کی ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ حاشیہ میں علل احادیث کی بنیاد پر انہوں نے احادیث کی قدر و قیمت واضح کردی ہے۔ مفتی صاحب غالباً حدیث کے استاذ ہیں اسی لیے احادیث پر انہیں اتنا عبور ہے۔ ضعیف اور موضوع احادیث کی تخریج میں انہوں نے ابن الجوزی، ملاعلی قاری اور علامہ طاہر فتنی (گجراتی) کی

'کتاب الموضوعات' سے فائدہ اٹھایا ہے۔لیکن عام احادیث کے بارے میں چند مشہور احادیث کو چھوڑ کر جو صحیحین یا سنن میں ہیں انہوں نے احادیث کے صرف دو منتخبات کی طرف رجوع کیا ہے۔ایک ہے حدیث کی بہت مشہور و مقبول کتاب 'المشکوٰۃ' اور دوسری 'جمع الفوائد' جس میں موجود بہت سی احادیث پر محدثین نے کلام کیا ہے۔جہاں تک 'مشکوٰۃ' کا تعلق ہے اس کے مرتب نے ہر باب میں تین فصلیں قائم کی ہیں، پہلی فصل میں صحیحین کی احادیث ہیں، دوسری میں سنن اور تیسری میں دیگر کتب احادیث کی روایتیں ہیں۔ان میں سے تیسری فصل کی روایتیں بلاتحقیق قابل قبول نہیں ہوتی ہیں۔دوسری فصل کی روایتیں بھی معلول ہوسکتی ہیں۔اس طرح مترجم محترم کی تخریج و علل پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے کیونکہ معلل حدیثیں دین کی بنیاد نہیں بن سکتیں۔ واضح رہے کہ بالغ نظر علماء کبھی کبھی 'مشکوٰۃ' کے حوالے تو دے دیتے ہیں لیکن 'جمع الفوائد' کا حوالہ دیتے کسی کو نہیں پایا۔بہتر ہوتا کہ مترجم محترم حدیث کی اصل کتب کے حوالے دیتے۔اس طرح کتاب کی ثقاہت میں اضافہ ہوتا۔سہولت کی خاطر مترجم **'المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث'** (آٹھ مجلدات) اور **'مفتاح کنوز السنۃ'** (فواد عبدالباقی) سے رجوع کر سکتے تھے۔یہ کتابیں ان کے زمانہ میں چھپ چکی تھیں۔

اس قیمتی کتاب کی اشاعت کو ایک عرصہ گزر چکا ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ اچھے میپ لیتھو پرنٹنگ پیپر پر مطبوع اس کا نیا اڈیشن شائع کیا جائے جس میں کمپیوٹر کی کتابت ہو اور احادیث کی تخریج ناچیز کی گذارشات کے مطابق مکمل طور سے کی گئی ہو۔کتاب کی پروف ریڈنگ بھی صحیح ہونی چاہئے کیونکہ صحیح پروف ریڈنگ نہ ہونے کی وجہ سے کتابیں اپنی قدر و قیمت کھودیتی ہیں۔امید ہے کہ حضرت پیر محمد شاہ لائبریری اینڈ ریسرچ سنٹر کے ڈائرکٹر جناب پروفیسر محی الدین بمبئی والا اور حضرت شاہ پیر محمد ٹرسٹ کے چیرمین جناب ڈاکٹر حبیب کاکی والا صاحبان اس مفید اور قیمتی کتاب کے طبع ثانی پر توجہ دیں گے کیونکہ یہ کتاب شریعت اور طریقت کے درمیان ایک پل کا کام دے گی۔

مطبوعات جدیدہ

ماضی آگاہ مستقبل نگاہ شبلی نعمانی: مرتبہ پروفیسر اختر الواسع اور جناب فرحت احساس، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۷۶، قیمت عام اڈیشن ۱۵۰ روپے، لائبریری اڈیشن ۳۰۰ روپے، پتہ: البلاغ پبلی کیشنز N-1، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی۔

علامہ شبلی کے متعلق اب تک شائع شدہ کتابوں اور مقالات ومضامین کے مجموعوں میں زیرنظر اپنے عنوان کے لحاظ سے منفرد ہے، یقیناً علامہ شبلی ملت اسلامیہ کے ماضی سے واقف تھے اور اس کا مستقبل جن پردوں میں نہاں تھا، ان کے درون میں جھانکنے کی ہمت اور صلاحیت بھی رکھتے تھے، زیرنظر کتاب کے ایک حصہ میں جہاں علامہ کی ماضی آگاہی کے نقشے کھینچے گئے ہیں وہیں دوسرے حصے میں علامہ شبلی کی ان نمائندہ تحریروں کا انتخاب بھی پیش کردیا گیا ہے جن سے علامہ کی مستقبل نگاہی کا تعین ہوجاتا ہے جیسے مسلمانوں کو غیر مذہب حکومت کا محکوم ہوکر کیوں کر رہنا چاہیے؟ مسائل فقہیہ پر زمانہ کی ضرورتوں کا اثر، مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم، اختلاف اور مسامحت، تعلیم قدیم وجدید، علم کلام پر ایک اجمالی نظر اور مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ، اس انتخاب بلکہ حسن انتخاب نے کتاب کی معنویت میں بڑا اضافہ کردیا، باقی حصہ اول میں دس مضامین شامل ہیں، غالباً یہ کسی مذاکرہ علمی کے مقالات کا انتخاب ہے گرچہ اس کا کہیں ذکر نہیں، پروفیسر اختر الواسع نے حرف آغاز میں کتاب کو خصوصی پیش کش کہہ کر ایک ادنی خراج عقیدت سے تعبیر کیا ہے اور اس عقیدت کا اظہار یہ کہہ کر کیا کہ ''شبلی نعمانی برصغیر ہند میں مسلمانوں کی تہذیبی وعلمی نشاۃ ثانیہ کے ایک ایسے نقش جمیل وجلیل ہیں جن سے صرف نظر کرکے ہندوستانی مسلمانوں کی گزشتہ ڈیڑھ سوسالہ تاریخ کی جو بھی شکل پیش کی جائے گی وہ نہ صرف نامکمل اور بے بضاعت ہوگی بلکہ استناد و تعبیر سے بھی محروم ہوگی'' کتاب میں علامہ کی شخصیت، افکار، اعمال، سماجی، تاریخی شعور، تعلیم، شاعری پر اچھی تحریریں آگئی ہیں، ایک مضمون میں الفاروق کی روشنی میں شبلی اور حسین ہیکل کا موازنہ بھی ہے، شبلی کے مداحوں اور معتقدوں کے لیے اس میں صرف اعادہ وتکرار ہی نہیں بعض

نئے معلومات بھی ہیں جیسے کتاب امتحان الاطباء لکافۃ الاطباء کے ایک قلمی نسخہ کے حصول میں علامہ شبلی نے کس طرح مدد کی یا نزہۃ الخواطر جیسی عمدہ اور قیمتی کتاب کی تالیف میں علامہ شبلی کا مشورہ شامل تھا یا مکاتیب امیر مینائی میں علامہ کی ایک تحریر ہے جو اب تک ان کی تحریروں کے کسی مجموعے میں شامل نہ ہوسکی اسی طرح میر نثار حسین نے علامہ کی وفات پر جو فارسی قطعہ تاریخ کہا وہ بھی گویا معدوم تھا، یہ سب ظفر احمد صدیقی کے مضامین میں آ گئے ہیں، جناب غضنفر کا مضمون بھی جدت کی لذت لیے ہوئے ہے، مضامین سب عمدہ اور مفید ہیں، کبیر احمد جائسی مرحوم نے یہ بتایا کہ شعر العجم کا مواد تو شبلی کا ہے لیکن ترتیب مولانا عبدالسلام ندوی اور مولوی ابوالحسان کی ہے، کاش ان مولوی ابوالحسان کی وضاحت ہو جاتی، ان کا یہ قول بھی 'شی عجیب' ہے کہ صرف شعر العجم ہی نہیں، تنقیدات شعر العجم کو بھی ہم سمجھ نہیں پائے۔ ایک مضمون میں یہ خیال بھی بحث طلب ہے کہ مولانا شبلی کے معاصر علماء کی اکثریت پر مدرسیت چھائی ہوئی تھی، اسی مضمون میں شبلی کا سال وفات ۱۹۴۰ دیا گیا ہے جس کی غلطی اظہر من الشمس ہے، اسی مضمون میں مولانا فاروق چریا کوٹی اور مولانا ارشاد حسین رام پوری سے شبلی کے رشتہ تلمذ کے حوالے سے کہا گیا کہ اس طرح مولانا شبلی علمائے دیوبند کے حلقہ تلمذ میں بھی شامل ہیں، مولانا احمد علی سہارن پوری اور مولانا فیض الحسن کا حوالہ دیا جاتا تو زیادہ صحیح اور بہتر ہوتا۔ مصری شبلی شناس جلیل سعید حفناوی کا مضمون محنت سے لکھا گیا اور اس کا اردو ترجمہ بھی اسی سلیقے سے کیا گیا ہے۔

علامہ شبلی نعمانی، شخصیت اور شاعری: ڈاکٹر مطیع الرحمٰن غاسق، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۴۹۰، قیمت ۳۰۰ روپے، پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی اور پٹنہ و مئو کے مکتبوں کے علاوہ مصنف کا پتہ چھتر پورہ، مئوناتھ بھنجن یوپی ۲۷۵۱۰۱۔

علامہ شبلی کی شاعری ان کے نثری کمالات کے سامنے عام طور پر ثانوی درجہ پر رکھی اور پرکھی گئی اور اس میں بھی فارسی اور اردو کے حسب و نسب کا رجحان ظاہر ہوتا رہا، خود شبلی جسے کبھی ہرزہ سرائی سے یاد کرتے، جب عالم حیرت میں داخل ہوتے تو آواز آتی کہ یہ پاکی گفتار آئی کہاں سے

ع در حیرتم کہ پاکی گفتارش از کجاست

وقت کے ساتھ ساتھ حیرت کی دنیا حقیقت میں بدلتی گئی اور نقادان شعر و ادب پر ظاہر ہوا کہ شبلی کی شاعری ان کے خلاقی کے بحر بے کراں کی ایک موج ہے مگر یہ موج کسی آبجو کی ہلکی سی لہر نہیں ہے بلکہ جوئے کہستاں کا سا جلال و جمال رکھتی ہے۔ زیر نظر کتاب میں اسی جوئے کہستاں کے جلال و جمال سے سرشار ایک نہیں کئی موجوں کا نظارہ کیا گیا ہے۔ پی ایچ ڈی کے لیے لکھا گیا یہ مقالہ لائق مصنف کی محنت، پاکیزہ ادبی و شعری ذوق اور اچھے سلیقے کا غماز ہے، انہوں نے شخصیت اور عہد و ماحول کے روایتی ابواب کے بعد علامہ کی قومی سیاسی، مذہبی، تاریخی، اخلاقی، تعزیتی شاعری کے ابواب قائم کیے ان میں رندانہ و معاشقانہ شاعری بھی شامل ہے، ابواب کی اس تقسیم سے شبلی کی پوری کائنات شعری کی سیر آسان ہوگئی، تنقید و تجزیہ کی زیادہ تلاش نہ کی جائے تو یہ کتاب اپنے موضوع پر سیر حاصل ہونے کا دعوی کرسکتی ہے اور اپنے پڑھنے والے کو اس اعتراف میں ایمانداری سے شریک کرسکتی ہے کہ علامہ شبلی نے فارسی اور اردو شعر کی جو گراں قدر خدمت کی ہے اسے ان دونوں زبانوں کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔

مکتوبات شبلی: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۶۰، قیمت ۲۵۰ روپے۔

علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط مع ضمیمہ مکاتیب مہدی حسن: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۳۶، قیمت ۲۴۰ روپے، پتہ: ادبی دائرہ، اعظم گڑھ اور مکتبہ دارالمصنفین اور اعظم گڑھ و علی گڑھ کے دوسرے مکتبے۔

علامہ شبلی کے علمی ورثہ میں ان کے بعد جو اضافہ ہوا اس میں ان کے حصہ مکاتیب کو بڑی اہمیت ملی، خطوط کے جمع و تدوین میں جامعین و مرتبین کا ذوق اور مصلحت کا شامل ہونا کوئی امر ناروا نہیں، مولانا سید سلیمان ندوی نے مکاتیب شبلی مرتب کی تو ان کے سامنے علامہ کے ہزاروں خطوط تھے، علامہ کی عقیدت میں وہ کسی ایسے مومن کی طرح تھے جس کے نزدیک قرآن کی سب سورتیں برابر ہیں، اس کے باوجود انہوں نے خطوط کے انتخاب میں کچھ اصول ملحوظ رکھے جیسے ان سے ذاتی سوانح کا کوئی واقعہ ظاہر ہو یا کسی علمی، اصلاحی اور قومی مسئلہ کا ذکر ہو یا انشاپردازی کا کوئی نمونہ موجود ہو، جمع و تدوین

میں ذاتی ذوق اور عام افادیت کے اس پہلو کے بہ پہلو خطوط شبلی جیسے مجموعے بھی ہیں، جو مثبت اور منفی جیسے الفاظ کے فرق و امتیاز کی وضاحت خود کرتے ہیں۔ بہرحال علم کے پتلے کا جب ایک رونگٹا بیکار نہیں سمجھا جاتا تو جواہر کی بے قدری کیوں کر ممکن ہے، مکاتیب شبلی اور خطوط شبلی اگر دو کنارے تھے تو ان کے درمیان وقتاً فوقتاً رسالات شبلی کی لہریں اٹھتی رہیں اور اب تک یہ سلسلہ جاری ہے کہ مختلف کتابوں اور رسالوں میں شبلی کے خطوط پہلی بار مطبوعہ ہونے کا شرف حاصل کرتے رہتے ہیں، ان کی تفہیم کی لذت تو اصل مضامین کے ساتھ حاصل ہوسکتی ہے لیکن زمانہ اب عجلت و سہولت کا ہے، اسی مقصد سے ان بکھرے جواہر ریزوں کو یکجا کیا گیا، ایسے خطوط بھی ہیں جو کہیں کسی شکل میں شائع نہ ہوئے تھے، ان کو بھی حاصل کیا گیا۔ تدوین و ترتیب کے نئے چلن میں حواشی سے مفر نہیں، سو اس کا بھی اہتمام کیا گیا ہے اور اب یہ جس شکل میں ہے وہ شبلیات کے شائقین کے لیے کارآمد اور مفید ہے۔

ثانی الذکر کتاب میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے وہ خطوط جمع کیے گئے ہیں جو علامہ شبلی کے ہم عصروں نے علامہ کو لکھے تھے۔ یہ خطوط بھی معارف اور دوسرے رسائل میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے۔ اس کتاب کے لائق مرتب نے بعض کتابوں میں کچھ پوشیدہ منظر محسوس کیے، نئی باتوں کے انکشاف کی توقع کی اور بعض نقادوں نے بقول مرتب رائی کو پربت بنانے کی جو کوشش کی اس کی اصلیت جاننے کی للک محسوس کی۔ اس اجمال کی تفصیل کی ضرورت ہے، بہرحال ان ہی اسباب کی بنا پر انہوں نے بقول خود "تلاش و جستجو میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا" اور اس کے بعد انہوں نے جو پایا وہ اس کتاب کے ذریعہ شائقین شبلی کے حوالے کر دیا اور صرف نقل و جمع کرنے پر اکتفا نہیں کیا، بعض رائج اغلاط کی جانب توجہ دلائی، دو ضمیمے اور علامہ شبلی کے والد شیخ حبیب اللہ اور مہدی افادی پر دو تحریریں بھی شامل کتاب کر دیں، لائق جامع نے مکتوبات شبلی کے متعلق کہا کہ یہ "جمع و تدوین میری متاع ذوق و نظر کا نتیجہ تھی" ثانی الذکر کتاب بھی نتیجہ ہو یا نہ ہو، متاع ذوق و نظر میں شامل کیے جانے کے لائق ہے۔

تنقیدی مباحث اور شبلی کا نظام نقد: ڈاکٹر شاداب عالم، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۲۶۰، قیمت ۱۲۰ روپے، پتہ: آدم پبلیشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، ۱۵۴۲ پٹودی ہاؤس، دریا گنج نئی دہلی-۲ اور مکتبہ دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ۔

اردو کی تنقیدی دنیا میں علامہ شبلی کے نظریات و اصول تنقید پر مباحث کی بنیاد فراہم کرنے

والی ان کی دو کتابیں شعر العجم اور موازنہ انیس و دبیر ہیں اور شبلی کے عہد میں تنقید کے حوالے سے موازناتی و تجزیاتی شخصیتیں بھی دو ہی ہیں یعنی منشی محمد حسین آزاد اور مولانا حالی، یہ ان شخصیتوں اور کتابوں کا اعجاز ہی ہے کہ ان کی بنیادوں پر اردو تنقید کی نہایت پرکشش، خوبصورت اور ایسی مضبوط عمارت کھڑی ہوئی۔ جس کے درو بام شبلی کے نام و کام سے ہم کلام رہے۔ اس خوبصورت اور لائق تعریف کتاب میں شبلی اور ان کے بعد کی اردو تنقید کی ایک صدی کے سفر کو جس طرح طے کیا گیا ہے وہ توصیف و تحسین سے زیادہ شکر و امتنان کا مستحق ہے، مصنف ابھی نوعمر ہیں، انہوں نے شعر العجم اور موازنہ کو شبلی کے ادبی و تنقیدی خزانہ عامرہ کا راس المال تو سمجھا ہے، مقالات شبلی اور مکاتیب شبلی کو بھی تنقیدی ٹکسال کے زر خالص کے طور پر دیکھا اور عہد شبلی کی تنقید، شبلی کے مآخذ، شبلوی تنقید کا آغاز و ارتقا، شبلی کا نظام نقد اور تنقید شبلی کے اثرات مابعد نقادوں پر جیسے عنوانوں کے تحت خود اپنی شبلی شناسی کے لیے مضبوط دلائل فراہم کر دیے۔ شبلی کے نزدیک لفظ و معنی کیا ہیں، تخئیل و محاکات کے علاوہ اخلاق و اثر آفرینی پر زور، شبلی کی تنقید نگاری کے اہم بلکہ لازم عناصر ہیں، اس کی تشریح بڑی دلآویز ہے، لیکن سب سے معلومات افزا باب دوم ہے جس میں شبلی کی تنقید کے مآخذ کے طور پر یونانی، عربی اور فارسی سرچشموں کی تلاش کی گئی ہے اور بڑے اعتماد کے ساتھ بحث کا خاتمہ یوں کیا گیا ہے کہ علامہ شبلی کا منطقی استدلال اور تجزیاتی طریقہ کار اوروں سے مختلف اور بڑے موثرات کا حامل ہے اور ان کی تنقیدی بصیرت کا کوئی حریف بھی نہیں۔ مصنف نے اس دعویٰ کی تائید میں پروفیسر عبدالحق کی ایک رائے نقل کی ہے کہ "مغربی تنقید کے مدعیوں نے مشرق کے اصول نقد پر شب خوں بھی کیا مگر ان کو مال غنیمت میں رسوائی ہی ملی" ہونہار مصنف کے لیے ڈاکٹر عبدالحق جیسے فاضل جلیل کے الفاظ محض تبریک ہی نہیں سند کا درجہ رکھتے ہیں کہ یہ کتاب شبلی کی تنقیدی بشارتوں کی تازہ تر مثال ہے، یہ مسلسل محنت اور دروں بینی کا مظہر ہے اور تحقیق کے خانہ ساز اور غیر مفید مصنوعات سے بہت بامعنی و ممتاز ہے۔ ہمارا بھی یہی تاثر ہے کہ شبلی صدی کے موقع پر یہ کتاب واقعی شبلی کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے معتبر سنگ نشاں ہے۔

ع - ص

رسید مطبوعہ کتب

۱-آقائے سخن وسیم خیرآبادی حیات اورکارنامے (مع انتخاب کلام): تحقیق وتدوین، ترتیب، فرید بلگرامی، فرید بلگرامی، بلگرامی بلڈنگ میاں سرائے خیرآباد سیتاپور۔ قیمت: ۲۰۰ روپے

۲-المقالات السبع : د۔اورنگ زیب الاعظمی، اختیار وترتیب محمد عمران علی الملا، الکتاب انٹرنیشنل جامعہ نگر، اوکھلا، نیودلہی، الہند۔ قیمت: ۵۰۰ روپے

۳-ڈاکٹر امام اعظم اجمالی جائزہ: ڈاکٹر ایم صلاح الدین، بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ، بہار۔ قیمت: ۱۵۰ روپے

۴-شاہ ولی اللہ دہلوی کی قرآنی خدمات : مرتبہ پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی، پروفیسر ظفرالاسلام اصلاحی، پبلیکیشنز ڈویژن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ قیمت: ۲۰۰ روپے

۵-عہد اسلامیہ میں دربھنگہ تحلیل وتجزیہ: سرور کریم، ادبستان، محلّہ گنگوارہ، پوسٹ سارا موہن پور، ضلع دربھنگہ (بہار)۔ قیمت: ۲۰۰ روپے

۶-فاطمی کمیٹی رپورٹ تجزیاتی مطالعہ: مرتب ڈاکٹر امام اعظم، بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ، بہار۔ قیمت: ۱۰۰ روپے

۷-گیسوئے تحریر (ادبی مضامین): ڈاکٹر امام اعظم، بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ، بہار۔ قیمت: ۱۰۲ روپے

۸-محمد بن حسن رومی خاں (تلک میدان اور دیگر توپوں کے حوالہ سے): اسلم مرزا، مرزا ورلڈ بک ہاؤس، نزد درگاہ نظام الدین، قیصر کالونی، اورنگ آباد۔ قیمت: ۱۲۵ روپے

۹-مستقبل: عالم نقوی، بکس اینڈ بکس، ۵ر تیج پوائنٹ، نول کشور روڈ، لکھنؤ۔ قیمت: ۳۲۰ روپے

۱۰-مسقط فی الاربعینیات من القرن العشرین : د۔صالح البلوشی، مرجعہ د۔ اورنگ زیب الاعظمی، روز ورد بوکس، نیودلھی، الہند۔ قیمت: ۲۰۰ روپے